مادری زبان، ذریعہ تعلیم اور بلوچی زبان

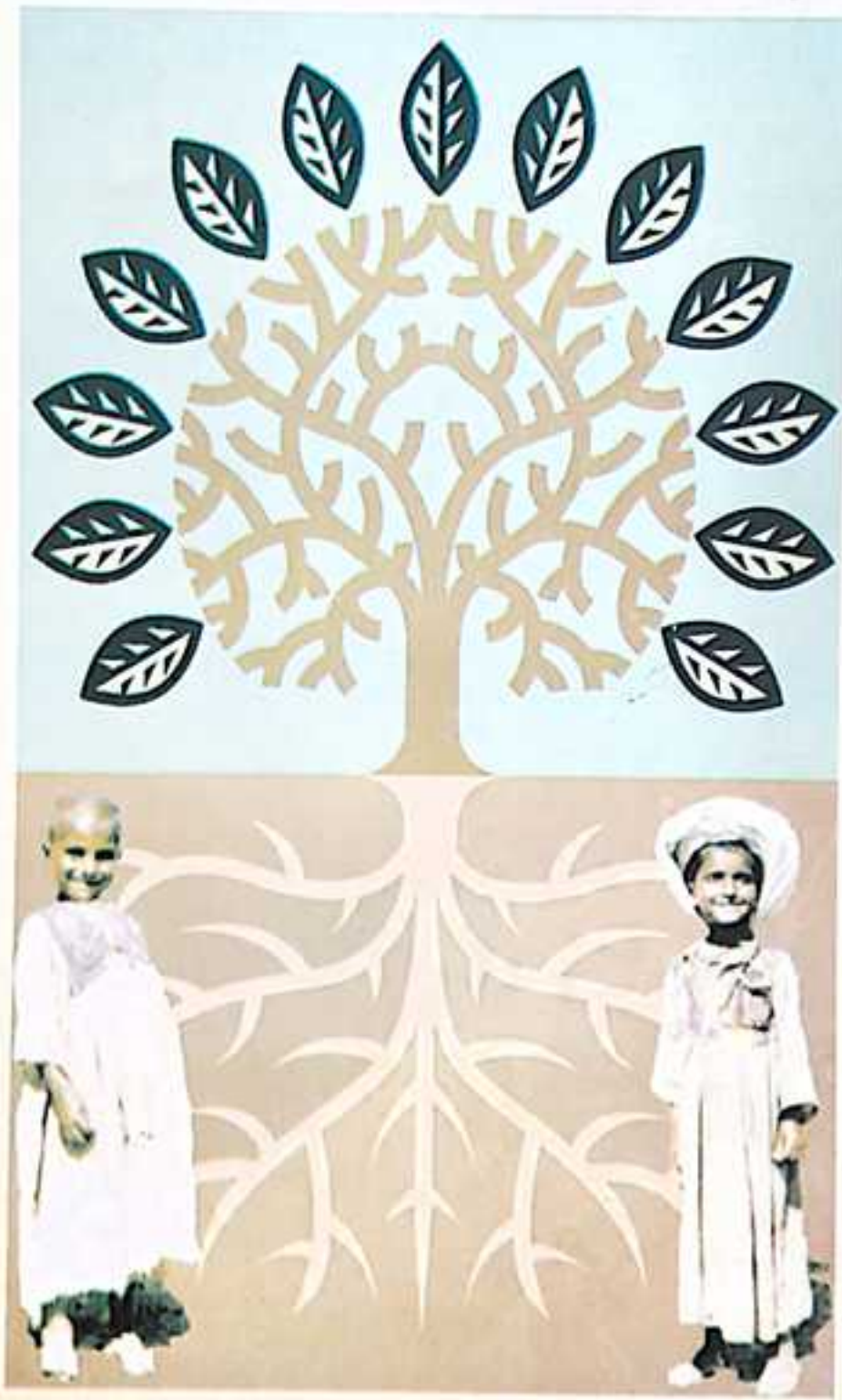

ڈاکٹر دین محمد بزدار

مادری زبان، ذریعہ تعلیم
اور بلوچی زبان

ڈاکٹر دین محمد بزدار

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

© بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

نام کتاب	:	مادری زبان، ذریعہ تعلیم اور بلوچی زبان
مصنف	:	ڈاکٹر دین محمد بُزدار
ڈیزائننگ	:	عزیز جمالدینی
پرنٹر	:	ہائی ٹیک پرنٹرز
سنِ اشاعت	:	فروری 2010
تعداد	:	500
قیمت	:	015

انتساب

شہید نواب محمد اکبر بگٹی کے نام جس نے بلوچستان
میں پہلی بار بلوچی براہوئی اور پشتو کو پرائمری تک
تعلیمی زبان قرار دیا۔

2	مادری زبان اور حکمرانوں کا رویہ	30
3	مادری زبان میں تعلیم عالمی تناظر میں	35
4	مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت	40
5	زبان اور قومی شناخت	44

حصہ دوئم

1	۲۰۰۸ زبانوں کا عالمی سال	ماٹسورا	49
2	ریاستی گرفت اور بلوچستان میں زبان پر اس کا اثر	کارینا جہانی	52
3	مادری زبان میں تعلیم، بلوچی زبان کی سلامتی اور اسے زندہ رکھنا	ٹم فیرل	74

پیش لفظ

یونیسکو کی طرف سے 17 نومبر 1999 کو یہ اعلان ہوا کہ 21 فروری کا دن مادری زبانوں کے لئے مختص ہوگی۔ 2008 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ قرارداد بھی مان لی کہ ہر سال 21 فروری کو مادری زبانوں کے عالمی دن کی مناسبت سے منایا جائے گا۔

2000 سے یونیسکو کے مرکز میں اس دن کو عالمی طور پر منانے کا اہتمام کیا گیا، اسی طرح کے اقدامات 2002 اور 2003 میں بھی کئے گئے۔ 2004 میں بچوں کو اپنی زبان سیکھنے اور ان کے لئے کتابیں چھاپنے کے متعلق زیادہ توجہ دی گئی تا کہ بچے کلاس روم میں اپنی مادری زبان کو پڑھیں اور اپنی زبان میں لکھنا سیکھ سکیں۔

اسی طرح 2005 کو اشاراتی زبان، 2006 کو زبان اور سائبر اسپیس، 2007 کو کئی زبانوں میں تعلیم، 2008 کو زبانوں کے عالمی سال اور، 2010 کو مختلف ثقافتوں وتہذیبوں کے مابین ہم آہنگی کا سال قرار دیا گیا۔ آج جب مادری زبانوں کی اہمیت کو عالمی سطح پر تسلیم کرلیا گیا ہے اس کا کریڈٹ یقیناً ان بنگالی شہداء کو جاتا ہے جن کی قربانیوں کی بدولت یہ عالمی ادارہ اس جانب متوجہ ہوئی۔

اس سلسلے میں اقوام متحدہ نے پالیساں تو بنالی ہیں مگر یہ پالیسیاں اُس وقت عملدرآمد کی حد تک پہنچ پائیں گی جب اقوام متحدہ اپنے ممالک کو واضح ڈائریکشن دے اور جس پر عمل نہ

کرنے کی سزا بھی مقرر کرے۔

اس پالیسی کو نظر انداز کرنے والے ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے پاکستان کے آئین میں مادری زبانوں کو بے شک صوبائی سبجیکٹ قرار دیا گیا ہے مگر یہ مرکز کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس معاملے میں صوبوں کو پابند کرے۔

اگر بلوچی زبان کو سرکاری، دفتری تعلیمی زبان بنانے کی کوششوں کی جانب ایک نظر ڈالی جائے تو اس سلسلے بلوچی زبان کے لئے ابتدائی سنجیدہ کوششوں کی ابتداء 1948 سے ہوئی۔ محترم اثیر عبدالقادر شاہوانی تاریخ خوانین قلات (میر احمد یار خان) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "4 جنوری 1948 کو دیوان خاص کے اجلاس منعقدہ ڈھاڈر میں نواب بائی خان گچکی سمیت تمام سردار موجود تھے۔ متفقہ طور پر بلوچی زبان کو حکومت قلات کی سرکاری اور قومی زبان تسلیم کر کے تعلیمی اداروں میں رائج کرنے کی سفارش کی گئی"۔

(روزنامہ جنگ کوئٹہ، میگزین 17 تا 23 فروری 2010)

اس کوشش کے بعد تاریخ کے اوراق میں بلوچی زبان کے لئے سنجیدہ کوشش اس وقت کی گئی جب "استمان گل" کی بنیاد ڈالی گئی۔

16 جولائی 1956 کو جب شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا جیل سے رہا ہوئے تو اپنی رہائی کے تقریباً ایک مہینے بعد وہ کراچی تشریف لائے جہاں انہوں نے ریاست قلات کے سیاسی کارکنوں کا اجلاس طلب کیا، میر غوث بخش بزنجو، میر گل خان نصیر، شہزادہ عبدالکریم، محمد حسین عنقا اور دوسرے اکابرین نے استمان گل کی بنیاد ڈالی اور نسلی، لسانی اور جغرافیائی

بنیادوں پر بلوچوں کے لئے ایک وحدت کا مطالبہ کیا اور ساتھ ساتھ بلوچی زبان کو اس وحدت کی سرکاری اور تحریری زبان قرار دینے کا بھی مطالبہ کیا۔ (تاریخ بلوچستان۔ میر گل خان نصیر صفحہ۔ 338)

جب نواب اکبر خان بگٹی شہید بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے عملاً مادری زبانوں کو اہمیت دی اور بلوچستان میں مادری زبانوں میں پڑھنے کی روایت ڈالی مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکی۔

بلوچستان کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں وطلباء تنظیموں کے آئین میں مادری زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ سلسلہ صرف آئین کے اغراض ومقاصد کی حد تک محدود ہے جس کا عملی مظاہرہ دیکھنے کی قوم متمنی ہے۔

مادری زبانوں کے عالمی دن کے موقع پر بلوچی اکیڈمی ''مادری زبان'' ذریعہ تعلیم اور بلوچی زبان کو نذر قارئین کر رہا ہے اس اُمید کے ساتھ کہ اس سے ایک بحث کا اغاز ہو اور مادری زبانوں کو ان کا جائز مقام ملے۔

یہ کتاب محترم ڈاکٹر دین محمد بُزدار کی کاوشوں کا ثمر ہے جس میں ان کی اپنی تحریروں کے ساتھ ساتھ (جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں) کارینا جہانی اور ٹم فیرل کے مضامین کے تراجم بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ

چیئرمین

پبلشنگ کمیٹی۔ بلوچی اکیڈمی۔

8 فروری 2010

تعارف

اس کتاب کو لکھنے اور ترتیب دینے کا مقصد یہ ہے کہ مادری زبانوں کی اہمیت کو اُجاگر کیا جائے۔ مادری زبانوں کی ضرورت اور اہمیت کا احساس نہ صرف ارباب اقتدار کے دلوں میں نہیں بلکہ خود ان کے بولنے والوں کے ذھنوں میں بھی دھندلا سا ہے، بلوچ باشعور طبقوں جیسے سیاسی ورکروں، طلبا، دانشوروں اور ادیبوں کے ذھنوں میں بھی مادری زبان کی اہمیت واجبی سا لگتا ہے۔ اور سب سے زیادہ پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ بلوچ سیاسی رہنماؤں کی توجہ اس طرف نہیں۔ ان طبقوں کو زبان کے حق میں متحرق کرنا ہے اور انہیں یہ یقین دلانا ہے کہ بلوچوں کی ترقی اور تشخص بلوچی زبان سے وابستہ ہے، اور بلوچی زبان کی ترقی اور بقا کی ضمانت اسے ذریعہ تعلیم قرار دینے میں مضمر ہے۔ بلوچوں کی آبادی بلوچستان کے رقبہ کے لحاظ سے بہت کم اور بکھری ہوئی ہے اور وہ تین ممالک ایران، افغانستان اور پاکستان میں تقسیم ہیں، ان ممالک کے حکمرانوں کا رویہ بھی بلوچی کے ساتھ ہمیشہ مخاصمانہ رہا ہے، اس کے علاوہ بلوچی نہ تو کسی صوبے کی دفتری اور سرکاری زبان ہے اور نہ اسکا کوئی ریڈیو سٹیشن اور ٹی وی چینل ہے، مزید یہ کہ بلوچی لکھنے اور پڑھنے والے بہت کم ہیں اس لئے اخبارات اور جرائد کا اجرا کامیاب نہیں رہتا۔ بلوچوں کی اپنی کوئی مارکیٹ نہیں، یہاں تک کہ

بلوچستان میں جو بڑے شہر آباد ہوئے ہیں مثلاً کوئیٹہ، زاہدان، ڈیراغازیخان اور خان گڑھ وغیرہ، وہاں پر بھی دوسری زبانوں کا غلبہ ہے، بلوچ ان علاقوں جہاں غیر زبانیں بولی جاتی ہیں اور انہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہے، کے مارکیٹ پر انحصار کرتے ہیں، اسلیئے ہمسایہ زبانیں جیسے فارسی پشتو سندھی بلوچی کو تیزی سے چاٹ رہی ہیں اس لیئے بلوچی کے معدوم ہونے کا خطرہ سب سے زیادہ ہے۔ تقریباً بیس سال پہلے ہم چند دوست لنڈ گاؤ جو ڈیراغازیخان اور تونسہ کے درمیان میں روڈ پر واقع ہے وہاں سے علاقہ موہوئی، وندر کے پہاڑی علاقہ جانا تھا گرمی میں پیدل چلنا مشکل تھا اس لیئے اونٹوں پر جانے کا فیصلہ ہوا، نزدیک جتوں کی بستی گئے، بستی والے بلوچی کے ساتھ سرائیکی ملا کر ایک نئی زبان بول رہے تھے میرے پوچھنے پر کہ آپ کونسی زبان بول رہے ہیں وہ ہنسے اور کہنے لگے ہم بلوچ ہیں اور بلوچی بول رہے ہیں۔

اس کتاب کے لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ملکی آئین میں صوبوں کے عوام کو مادری زبان میں تعلیم کا حق دیا گیا ہے اور سندھی یہ حق استعمال بھی کر رہے ہیں، یہ صوبائی حکومت ہے جو اس پر عمل نہیں کر پا رہی بعض حلقوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ مرکزی حکومت اسکی ذمہ دار ہے وہ اپنے اخباری بیانات اور تقاریر میں اکثر یہی کہتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر دین محمد بزدار

حصہ اول

(With out prejudices to the status of national language a provicial Assembly may by law priscribe measures for the teaching promotion and use of a provincial language in addition to national language)

ترجمہ: ''قومی زبان کے مرتبہ سے بدگمانی پیدا کئے بغیر ایک صوبائی اسمبلی کو قانونی اختیار ہے کہ وہ قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کو پڑھانے اور اسکی ترقی کے لیئے اقدامات تجویز کرے''

بلوچ، بلوچستان اور بلوچی

بلوچ وسیع سرزمین پر آباد ہیں، جس کے شمال میں ہلمند (افغانستان) جنوب میں بحر عرب، مغرب میں دریائے سندھ اور مشرق میں سیستان (ایران) ہے، اس خطہ کو نصیر خان نوری والیء قلات نے بلوچستان کا نام دیا۔ بلوچ کون ہیں؟ کہاں سے آئے؟ اور کب آئے؟ جیسے سوالوں کے جوابات کی خاطر ہم ایک قدیم تاریخی کتاب (گردگال نامک) جسکا ابھی حال ہی میں انکشاف ہوا سے مدد لیں گے یہ کتاب اخوند محمد صالح زنگنہ کرد بلوچ نے فارسی میں تقریباً چار سو سال قبل لکھی تھی، اس کتاب کے مطابق بلوچ نسلاً کرد ہیں اور بوجہ اپنی فوجی نشان جو مرغی کا قلغی تھا جسے قدیم فارسی اور کردی زبانوں میں بلوچ کہتے ہیں، بعد میں یہ لوگ اسی نام سے موسوم ہو گئے اور انکی زبان کردی کی بجائے بلوچی کہلائی، بلوچی وہ زبان ہے جس میں آتش پرستوں کی کتاب آوستا لکھی گئی، اس طرح بلوچی ایک مقدس کتاب کی مقدس زبان ہے، اُس وقت بلوچ آتش پرست تھے، اس کے علاوہ ھخامنشی دور کے لکھے کتبے بھی کسی اور زبان سے زیادہ بلوچی سے مشابہت رکھتے ہیں، پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی نے اس کتاب کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا اور بلوچی اکیڈمی نے اسے فارسی اور اردو میں

شائع کیا۔ مصنف کے مطابق اس نے یہ تاریخی مواد اپنے اجداد کے اسلامی مدرسے، جسے امیر تیمور گورگان نے ۱۳۸۳ء مطابق ۷۸۵ھ سیستان کے پایہ تخت زرنج پر قبضہ کے دوران لوٹ کر منہدم کیا تھا، کی بچی ہوئی تحریروں سے حاصل کیا تھا جو اس کے اجداد زرنج سے زابل لائے تھے، اس طرح یہ مواد چھ سو سال سے زیادہ قدیم ہے،

کتاب میں بلوچ تاریخ اسطرح بیان کی گئی، جب پیشدادی خاندان کا آخری بادشاہ گرشاسپ فوت ہوا تو مادستان (کردستان) و فارس میں طوائف الملوکی نے جنم لیا، مادستان اور فارس کے امرء اور سردار اکٹھے ہوئے اور متفقہ طور پر مادکرد قبیلے کے سردار قیقباد کو ۸۵۰ق م مادستان و فارس کے تخت پر بٹھایا، اسوقت مادستان کا دار الخلافہ اکباتان تھا، اس پر توران کے بادشاہ افراسیاب نے مخالفت کا جھنڈا بلند کیا کیونکہ وہ وراثت کی رو سے اپنے آپ کو پیشدادی خاندان کا حقدار سمجھتا تھا، اس جنگ میں افراسیاب کو شکست ہوئی، قیقباد نے توران کے علاقوں کو ان کرد قبائل میں تقسیم کیا جو جنگ میں شریک تھے، تاکہ اسکی سلطنت کی مشرقی سرحدیں محفوظ رہیں۔ اسطرح زنگنہ کرد بلوچ زابلستان میں، براخوئی کرد بلوچ توران اور اردگانی، کرمانی، مالی مکران میں آباد ہوئے۔ یہ پانچوں قبائل کردوں کے ماد قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح بلوچ انہی کرد قبائل کے اولاد ہیں جو تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح اس خطہ میں وارد ہوئے۔ توران میں بائیس ترک قبائل پہلے سے موجود تھے، جو تُورک زبان بولتے تھے، انہوں نے فاتح براہوئی کردوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، براہوئی اور تُرک قبائل کے

غلط ملط ہونے سے بلوچی زبان سے متاثر ہوئے تُورک زبان موجودہ براہوئی زبان کی شکل میں وجود میں آئی۔

مادکردوں نے سلطنت مادستان و فارس پر چھ پشتوں تک تقریباً تین سو سال حکومت کی، ان فرمانرواؤں کے نام یہ ہیں، قیقباد، کیکاؤس، توس، جو کیخسرو کے نام سے بھی معروف ہوا، فریبرز، کو کسار اور آزدیاک۔ کردوں کے آخری بادشاہ، آزدیاک نالائق تھا، لوگ اس سے تنگ آ گئے تھے اسکی اپنی نرینہ اولاد نہ تھی، مادستان و فارس کے امراء و سرداروں نے باہمی مشورہ سے کورش ہخامنشی کو، جو فارس کا امیر تھا تخت پر بٹھایا۔ کورش نے کردوں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے، ہخامنشی حکمرانوں کے وقت تمام کرد امراء اپنے اپنے ولائتوں پر برقرار رہے۔ ہخامنشی حکمرانوں نے نو پشتوں تک حکومت کی، دارا سوئم ہخامنشی خاندان کے آخری بادشاہ کو سکندر اعظم نے شکست دی اور پھر اسکے اپنے لوگوں نے اسے پکڑ کر ہلاک کر دیا، تا کہ وہ سکندر کے تعاقب سے نجات پا سکیں۔

ادیب، شاعر، گلوکار اور بلوچی

مغربی بلوچی لہجے میں تقریباً ہر میدان میں کام ہو رہا ہے۔ ادیب اور شاعر زبان دل لگا کر بلوچی زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ کوئٹہ، تربت اور کراچی سے کئی ماہتاک (ماہنامے) نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک روز نامہ بھی نکلتا ہے۔ ان رسائل میں سیاسی مضامین، ڈرامے، افسانے و شاعری کے ساتھ ساتھ ہر موضوع پر لکھا جاتا ہے۔ روز نامہ آساپ کا ایک صفحہ ہفتے میں دو دن بلوچی کے لیئے مختص ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال کئی کتب شائع ہوتے ہیں۔ نامور شاعروں کے کلام کتابی صورت میں موجود ہیں۔ گلوکاروں کے ویڈیو آڈیو ہر جگہ دستیاب ہیں۔ بلوچی فلم اور ڈرامے گھروں میں شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ بولان اور سنر بات بلوچستان ٹی وی کی نشریات اسی لہجہ میں ہیں۔ عام لوگ اپنی زبان سے محبت کرتے ہیں اور اسکی ترقی کے لیئے کام کر رہے ہیں۔ املا کا اختلاف پھر بھی موجود ہے۔ ہر ادیب اپنے پسند کے مطابق لکھنے پر بضد ہے۔ لیکن بلوچی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کرانے کے لیئے کوششیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لوگوں میں یہ آگاہی نہیں کہ بلوچی زبان اور بلوچ قوم کی بقا اور ترقی بلوچی کو تعلیمی زبان قرار دینے میں ہی مضمر ہے۔ اس کے مقابلے میں سلیمانی بلوچی لہجہ جو سی نصیر آباد

،ڈیرہ بگٹی، کوہلو، ڈیرہ غازیخان، جیکب آباد اور اندرون سندھ میں آباد چالیس لاکھ سے زیادہ بلوچوں کی اب بھی مادری زبان ہے، میں بدقسمتی سے ایک بھی جریدہ شائع نہیں ہوتا۔ سلیمانی بلوچی میں سب سے پہلی تصنیف شیر محمد مری کی ''بلوچی کہنیں شاعری'' اور'' بلوچی زبان ءُ ادب ءِ تاریخ'' ہیں جن میں مری صاحب نے حسب ضرورت سندھی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ محمود خان المعروف مومن بزدار نے مشہور شاعر چگھا بزدار کے کلام کو یکجا کر کے ''چگھاء گفتار'' کے نام سے شائع کرایا۔ ہوسکتا ہے سلیمانی لہجہ میں کسی اور نے کوئی کتاب لکھی ہو جسکا مجھے علم نہ ہو۔ سلیمانی لہجہ کے شعرا میں تخلص کا رواج نہیں۔ شعرا کی اکثریت دھاتیوں کی ہوتی ہے اس لیئے انکی شاعری میں دوسرے زبانوں کے الفاظ کا استعمال بہت ہی کم ہوتا ہے۔ انکی شاعری میں مٹھاس اور فطری رنگ اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ پریس تک انکی رسائی نہیں۔ انکی شاعری عام طور پر نڑ،سر کے ساتھ گائی جاتی ہے۔ اور کئی سال تک زندہ رہنے کے بعد ایسے شعرا اکثر گمنام ہو جاتے ہیں۔ ان پڑھ شاعروں کی شاعری قدرتی اور فی البدیع ہوتی ہے اور ہر شعر طویل ہوتا ہے ان شاعروں کو اپنے اشعار زبانی یاد ہوتے ہیں۔ نُڑی ان اشعار کو یاد کر کے نڑ کے ساتھ محفل میں گاتے ہیں مشرقی بلوچستان میں نڑ سر عام موسیقی ہے۔ اسے بچے بوڑھے، عورتیں مرد شوق سے سنتے ہیں۔ نڑ کے ساتھ ہر موضوع کی شاعری گائی جاتی ہے۔ نڑ کے تقریباً تیس، چالیس دھنیں (لئے) ہیں۔ ہر دھن کو دستانہ کہتے ہیں۔ کوئی بھی شعر ایک نہ ایک دھن پر صحیح بیٹھتی ہے۔ بزدار علاقہ میں ایک دستانہ اللہ تعالی کی تعریف

کے لیئے مخصوص ہے جسے ''اللہ تو ئیں'' کہتے ہیں جسکے معنی ہیں اللہ تو ہی ہے۔ یہ دھن محفل کے شروع میں اور پھر آخر میں بجایا جاتا ہے۔ دو، تین دھنیں علاقائی پیروں کے نام پر ہیں۔ باقی دھنیں عشقیہ اور رزمیہ ہیں۔ ناڑی (نڑ بجانے والا) اور سری (نڑ کے ساتھ گانے والا) کو معاشرے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر نوجوان ناڑی ،سری بننے کی آرزو دل میں لیئے پھرتا ہے۔ سنا ہے مشہور ناڑی مینگلا کی بیٹی نڑ بجاتی ہے کسی اور عورت کے بارے نہیں سنا۔ گھر میں نڑ بجانا قطعاً معیوب نہیں، تیس چالیس سال پہلے ہر کھڈر بولک (۱۵۔۲۰ گھرانوں پر مشتمل خاندان) میں ایک ناڑی اور سری اکثر ہو تا تھا۔ آجکل ایک تو ٹیپ ریکارڈ عام ہونے اور دوسرا بیرونی اثرات کی وجہ سے ناڑی سری کم ہو گئے ہیں، اب بھی مشرقی بلوچستان میں نڑ سرواحد موسیقی ہے جو مقبول عام ہے۔ چھوٹے سائز کے نڑ کو لنڈی یا ڈھو کہتے ہیں۔ اگر سائز بہت چھوٹی ہو تو اسے ''زمبلی'' کہتے ہیں۔ سنا ہے مولانا روم کے قبر پر ایک نڑ رکھا ہے جسے وہ بجاتے تھے۔ مشرقی بلوچستان کے دوسرے مقبول ساز سرینداور جوڑی (الغوزہ) ہیں۔ جن کے ساتھ بھی سری سر دیتا ہے۔ اور انکی دھنیں نڑ والی ہی ہوتی ہیں۔ نڑ کی چند دھنوں کے نام یہ ہیں۔ لفنگ۔ شیشک۔ پھرک۔ دادلی۔ چنی دامن (شوذع)۔ آفانی پھری۔ درا ئی۔ اللہ تو ئیں (اللہ تھوائے) وغیرہ۔

بلوچی زبان، رسم الخط اور املا

بلوچی زبان کے دو بڑے لہجے ہیں۔ کی کا خیال ہے کہ تین ہیں۔ پھر ہر لہجہ معمولی فرق کے ساتھ کی تلفظ پر مشتمل ہے۔ اسکی بنیادی وجہ بلوچی زبان کا معیاری نہ ہونا یعنی بلوچی میں تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ دوسری وجوہات میں وسیع رقبہ، بکھری آبادی، پسماندگی، انفراسٹرکچر کا نہ ہونا، حکومتی سرپرستی سے محرومی اور مارکیٹ پر دوسری زبانوں کا غلبہ ہے۔ دو بڑے لہجے سلیمانی اور مکرانی یا مشرقی اور مغربی ہیں تیسرا رخشانی ہوسکتا ہے گوکہ وہ مکرانی لہجے کے قریب تر ہے۔ کی کا خیال ہے رخشانی مکرانی اور سلیمانی لہجوں کو ملانے والا لہجہ ہے۔ عام بلوچ دوسرے لہجہ کو مشکل سے سمجھ پاتا ہے شاعری کو سمجھنا اور لطف اندوز ہونا تو دور کی بات ہے۔ ڈر ہے لہجوں کی یہ دوری بڑھتے بڑھتے دو زبانوں کی شکل اختیار نہ کر جائے۔ اس پر بلوچ ادباً، دانشوروں اور باشعور طبقہ کو لازمی توجہ دینی چاہیے۔ افسوس ہے کہ ہمارے قوم پرست زبان کے مسلے کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ بلکہ اس مسلے کو نہ چھیڑنے فراموش کرنے اور یہاں تک کہ دبانے کی پالیسی پر گامزن لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم رکمیونٹی کی ترقی اور خوشحالی اسکی زبان کی ترقی سے مشروط ہے۔ بدقسمتی سے قوم پرستوں کی تمام انرجی پارلیمنٹ تک رسائی پر صرف ہورہی ہے۔ اور اسی طرح سٹوڈنٹس ونگز بھی زبان کے اہمیت سے بے خبر ہیں۔

اس پر اختلاف نہیں کہ بلوچی عربی رسم الخط میں تحریر کی جائے، صرف املا (spelling) پر اتفاق نہیں ہو پا رہا۔ در اصل معیاری رسم الخط اور املا ایک اتھارٹی (Athority) ہی رائج کرتی ہے اور پھر اسکی سرپرستی کرتی ہے۔ اگر حکومت توجہ نہ دے، تو میرے خیال میں پھر یہ اتھارٹی بلوچی اکیڈمی ہی ہوسکتی ہے۔ اسے ہر سال بلوچی میں درجنوں کتب شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اور بلوچی اکیڈمی کا فرض ہے کہ وہ برسر اقتدار حکومتی حلقوں کو قائل کرے کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم ہی بہترین تعلیم ہے۔ اور یہ حقیقت یونسکو کا منظور شدہ ہے۔ جب ایک ہی رسم الخط اور املا میں ۶/۵ لاکھ افراد مدرسوں سے پڑھکر فارغ ہونگے تو بلوچی ادیب/ادیبہ بھی وہی رسم الخط، املا اپنانے پر مجبور ہونگے۔

اس طرح معیاری زبان کی جو خاص قسم تعلیم میں رائج ہوتی ہے وہ زبان کی سمت کو اس طرف متعین کرتی ہے، جسطرف اسے جانا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں دونوں لہجوں کو قریب تر لانے کا اس سے بہتر اور انتخاب نہیں ہوسکتا کہ دونوں کو ایک ہی طرح لکھا جائے اور ادائیگی (تلفظ) ہر کوئی اپنے لہجے میں کرے۔

شہید نواب اکبر خان بگٹی جب وزیر اعلی بنے انہوں نے مادری زبانوں بلوچی، براہوئی، پشتو میں پرائمری تعلیم کی ابتدا کرائی۔ بلوچی میں پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے لیئے جو کتب لکھی گئیں ان میں دونوں لہجوں کو ایک طرح لکھا گیا۔ اس کی نواب صاحب نے منظوری دی تھی۔ اس کے لیئے پانچ نئے

حروف اپنائے گئے جو یہ ہیں۔

(۱)ت :ت اورث کے لیئے جیسے،مات۔یا۔ماث۔یا۔ماس۔

(۲)ف: پ اورف کے لیئے جیسے لاپ یا لاف۔

(۳)ذ :داورذ کے لیئے جیسے واد یا واذ۔

(۴) ک:خ اورک کے لیئے جیسے گنوک یا گنوخ۔

(۵)ک: گ اورغ کے لیئے جیسے روگ یا روغ۔

اس سے بہتر کوئی متبادل ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ویسے تو مجھ سمیت ہر بلوچ یہی کہے گا اور چاہے گا کہ اسکے علاقے یا لہجے کی بلوچی سب سے اچھی ہے۔ہر کوئی اسے اپنائے اور اسے ہی تعلیمی اداروں میں پڑھایا جائے۔لیکن بلوچی زبان کی دیرپا مفاد میں جو بہتر اور ممکن ہو وہی ہونا چاہئے۔

زبان اور اسکی طاقت

بچپن میں یہ ضرب المثل سنا تھا ''پڑھو فارسی بیچو تیل۔ آگے آگے دیکھو قدرت کے کھیل،، یعنی فارسی پڑھنے کے باوجود تیل بیچنے جیسا ادنا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ محاورہ مغلیہ دور کا ہی ہوسکتا ہے، جب ہندوستان میں فارسی کی طوطی بولتی تھی۔ اس سے زبان کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، زبان کی طاقت کسی زبان کی وہ خصوصیت ہے جو وہ اپنے بولنے اور استعمال کرنے والوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تسکین کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ جیسے اچھا کاروبار، اچھی نوکری، بنگلہ گاڑی، عزت، شہرت وغیرہ۔ بلوچی پشتو پنجابی سندھی اور اردو سب پاکستانی زبانیں ہیں لیکن اردو سب سے زیادہ طاقتور زبان ہے۔ انگریزی گوکہ پاکستان میں کسی کی زبان نہیں لیکن انگریزی اردو سے بھی طاقتور ہے۔ کسی فرد کو طاقت روزگار سے ملتی ہے۔ اور کوئی بھی طاقت کے دائرے میں اسوقت داخل نہیں ہوسکتا جب تک اسے کسی اجارہ دار زبان یا زبانوں پر عبور حاصل نہ ہو۔ انگریزی زبان پہلے برطانیہ اور اب امریکہ کی معاشی اور فوجی برتری کی وجہ سے بین الاقوامی زبان بن گئی۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے دنیا کی بڑی زبانوں جیسے ہندی، روسی فرانسیسی وغیرہ کو انگریزی سے خطرات لاحق ہوگئے۔ ہمارے ملک میں بھی

بلوچی، پشتو، پنجابی اور سندھی کو انگریزی اور اردو سے ویسی ہی خطرات لاحق ہیں۔ کیونکہ ان زبانوں کو حکومتی سرپرستی حاصل ہے اور طاقت کے دائرے میں یہی زبانیں استعمال ہوتی ہیں اور اپنے استعمال کرنے والوں کو روزگار اور عزت دے سکتی ہیں۔ بلوچی، براہوئی، پشتو، پنجابی کی وہ حیثیت نہیں کہ اپنے استعمال کرنے والوں کو عزت اور روزگار دلا سکیں۔ پشتو، پنجابی اور سرائیکی بڑے شہروں اور بڑی آبادی کی زبانیں ہیں اس لیئے انکی سلامتی کو کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں۔ بلوچی براہوئی نہ تو شہری زبانیں ہیں اور نہ انکے بولنے والوں کی کثیر آبادی ہے۔ بلوچ وسیع بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لیئے بلوچی۔ براہوئی زبانیں مٹنے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ کئی ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ زبان مرتی ہے کیونکہ وہ خودکشی کرتی ہے۔ خودکشی سے انکی مراد یہ ہے کہ زبان بولنے والے اسے بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اگر کوئی اس بات کا تجزیہ کرے کہ لوگ اپنی زبان بولنا کیوں چھوڑ دیتے ہیں تو وہ آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ زبان سرکاری سرپرستی سے محروم ہونے کی وجہ سے طاقت اور اختیار کی سطح پر استعمال نہیں کی جاتی۔ اس کے بولنے والے وہی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں عزت اور روزگار دے سکے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انکی زبان اشرافیہ کی زبان نہیں اور انکی زبان انہیں عزت اور روزگار نہیں دے سکتی تو وہ اپنی زبان پر شرمندہ ہوتے ہیں اور اسے بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں انکی پسماندگی، غربت، دربدری میں انکی زبان اور شناخت کا بھی ہاتھ ہے۔ ان

وجوہات کی بنا پر ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جو زبان کو قتل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ حالات کسی اور طاقتور زبان کے لیئے سازگار ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اس لیئے ایسے طاقتور زبان کو قاتل زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنی زبان سے بیگانگی اور اسکی عزت نہ کرنے کی مثال ڈیرہ غازیخان، نصیر آباد اور جیکب آباد کے بلوچوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں اُردو سرائیکی اور سندھی کا غلبہ ہے۔ اور بلوچی صرف چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ان علاقوں میں بلوچی کو خودکشی کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی حال ایران اور افغانستان میں بلوچی کا ہے۔ جہاں پشتو اور فارسی کا مکمل غلبہ ہے۔ کراچی کے بلوچوں کو شاباش ہے جو نا مساعد حالات کے باوجود نہ صرف اپنی زبان بچائے ہوئے ہیں بلکہ اسکی ترقی کے لیئے دن رات کام کر رہے ہیں۔ اگر حکومت سرکاری سطح پر بلوچی براہوئی ارسرائیکی زبانوں کو تعلیمی اداروں، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بلوچستان میں جائز مقام دے تو یہ زبانیں اپنے بولنے اور استعمال کرنے والوں کو روزگار اور عزت دونوں طرح کے مواقع فراہم کر سکتی ہیں۔

بلوچ علماء کرام اور بلوچی زبان

بلوچی زبان کی خدمت میں علما کا کردار بنیادی رہا اور آج بھی ہے۔علما مسجد اور مدرسوں میں دین کی تبلیغ اپنی مادری زبان میں کرتے ہیں اس طرح زبان کی خدمت میں انکا ایک کردار ہے۔کئی علماء کرام بلوچی زبان کے مشہور شاعر رہے ،جیسے ملا مزار، ملا فاضل۔علماء میں سب سے زیادہ بلوچی زبان کی خدمت کا اعزاز مولانا خیر محمد ندوی کو جاتا ہے جنکی کوششوں سے ۱۹۵۳ میں ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی نشریات کا آغاز ہوا۔انہوں نے کراچی میں ایک سکول بھی کھولا جس میں بلوچی پڑھائی جاتی تھی۔بھٹو کے دور میں اس سکول کو بھی قومیایا گیا، پھر اسکا انتظام انہیں واپس نہ مل سکا۔مولانا صاحب کراچی سے ماہنامہ ''اومان'' کے نام سے ایک بلوچی ماہتاک بھی نکالتے رہے۔اس کے علاوہ ڈھاڈر، درخان سے مولانا محمد فاضل درخانی نے ''مدرسہ درخانی'' کی بنیاد رکھی۔مولانا حضور بشک جتوئی اور مولانا محمد عمر دینپوری ان کے ساتھ اسی مدرسہ میں کام کرتے رہے۔ان علماء کرام نے پہلی بار قران مجید کا بلوچی اور براہوئی میں ترجمہ کیا اور بلوچی ، براہوئی میں سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔اور بھی کئی علما نے زبان کی خدمت کی ہوگی۔لیکن افسوس بلوچ علما میں اب زبان کی خدمت کا وہ پہلے والا

جذبہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ غیر ضروری طور پر ہر جگہ مادری زبان پر اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ذاتی تجربہ کی بنیاد پر دو واقعات کا یہاں ذکر کرونگا، جب میری پوسٹنگ خضدار میں تھی ایک بار جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد گیا مولوی صاحب اردو میں تقریر کر رہے تھے۔ انکی اردو اچھی نہ تھی اور مشکل سے بول پا رہے تھے۔ نمازیوں کی اکثریت براہوئی بولنے والے ان پڑھ مزدوروں کی تھی۔ میرے خیال میں نہ مولوی صاحب اپنا مدعا صحیح بیان کر پا رہے تھے اور نہ سامعین مفہوم سمجھ رہے تھے۔ اگر مولوی براہوئی میں تقریر کرتے جو انکی اور سامعین دونوں کی زبان تھی تو وہ اپنا پیغام نمازیوں تک بہتر پہنچاتے اور نمازی بھی ان سے فیضیاب ہوتے۔ ہماری کمزوری یہ ہے اگر دس آدمیوں میں ایک غیر بیٹھا ہو تو ہم اسکی زبان یا اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرا واقعہ کوئیٹہ کا ہے گولی مار چوک کے نزدیک سبزل روڈ پر ایک مسجد میں مولوی صاحب فارسی میں تقریر کر رہے تھے نمازیوں کی اکثریت بلوچ تھی صرف چند افراد اور مولوی صاحب فارسی بان افغان مہاجر تھے۔ مجھے خضدار کے بلوچ مولوی یاد آ گئے اور سوچتا رہا ہم نے وطن دوستی اور اپنی زبان سے محبت کا جذبہ کہاں کھو دیا۔

قوم پرست اور بلوچی زبان

بلوچ قوم پرستوں نے بلوچی کو کبھی سہارا نہیں دیا حالانکہ انہیں بے شمار مواقع ملے۔ اگر وہ چاہتے تو زبان کی ہر طرح سے خدمت کر سکتے تھے۔ جیسے بلوچی کو صوبائی زبان کا درجہ دینا، مادری زبانوں میں تعلیم یا کم از کم انہیں ایک مضمون کی حیثیت سے ابتدائی درجوں سے پڑھانے کا پروگرام۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اکثر قوم پرست رہنما، دانشور اور پڑھے لکھے بلوچ قومی تشکیل میں زبان کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اور انہیں معاشی مواقعوں کے حوالے سے بھی زبان کی اہمیت کا بخوبی علم ہے۔ لیکن پھر بھی وہ زبان کے مسئلے پر ذرا برابر پیش رفت کے لیئے تیار نہیں ہوتے۔ رہنماؤں کی وجہ سے سیاسی ورکروں اور طلبا تنظیمیں بھی زبان کے مسلے کو اہمیت نہیں دیتیں۔ ان سے جب اس مسلے پر بات کریں تو وہ معقول جواب نہیں دے پاتے۔ بلکہ جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلا موقع نیشنل عوامی پارٹی کو ۱۹۷۳ء میں ملا تھا۔ تہتر کے آئین پہلی بار صوبوں کو اپنی زبان کو صوبائی زبان قرار دینے، مادری زبانوں میں تعلیم اور انکی ترقی کا حق ملا۔ سندھیوں نے اسکا فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھی کو سندھ کا دفتری اور تعلیمی زبان قرار دیا۔ لیکن گورنر بلوچستان میر غوث بشک بزنجو نے اردو کو صوبے کا سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ اس فیصلہ میں نیپ کی بلوچ لیڈرشپ برابر کی شریک تھی۔ لیاری کے ورکروں نے احتجاج کیا اور کئی نیپ اور بی ایس او سے مستعفی ہو گئے تھے۔

سردار عطا اللہ مینگل نے حال ہی میں اپنے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا کہ یہ انکی بڑی غلطی تھی۔ جب ۱۹۸۹ میں شہید نواب اکبر خان بگٹی وزیر اعلی بنے تو انہوں نے وطن دوستی اور قوم پرستی کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے تاریخ میں پہلی بار بلوچی، براہوئی اور پشتو کو صوبے میں پرائمری تک ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ اساتذہ کو تربیت دی گئی، بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ نے بلوچی، براہوئی اور پشتو زبان میں کتابیں چھاپ لیں اور پڑھائی کا آغاز ہوا۔ اسی دوران نواب صاحب کی حکومت ختم ہوگئی۔ نئے الیکشن ہوئے نواب صاحب کی پارٹی اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی تھی لیکن فرشتوں کی آشیر باد سے تاج جمالی وزیر اعلی بن گئے۔ مادری زبانوں میں تعلیم کا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ قوم پرست پارٹیاں تاج جمالی حکومت کا حصہ بنیں، زبان کے مسلے پر خاموش رہ کر شاید انہوں نے اپنی پاک دامنی کا ثبوت دیا ہوگا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ قوم پرستوں کے ساتھ ساتھ دانشوروں، ادبی تنظیموں، اکیڈمیز اور سٹوڈنٹ تنظیموں نے ذرا برابر احتجاج نہ کی اور بالکل خاموشی چھائی رہی۔ پھر ڈاکٹر مالک صاحب کئی سال وزیر تسلیم رہے ،سردار اختر مینگل وزیر اعلی بنے، بار بار کی یاددہانیوں کے باوجود کسی نے اس مسلے پر توجہ نہ دی۔ ایک دانشور نے صحیح کہا کہ بلوچ پشتون نیشنلزم قدیمی ہے۔ قوم پرست صرف معاشی مطالبوں کی بات کرتے ہیں زبانوں کی ترقی کے بغیر حقیقی خود مختیاری ممکن نہیں۔ صوبے میں بلوچی براہوئی سرائیکی زبانوں کو اسوقت تک اپنا جائز مقام نہین مل سکتا جب تک سیاسی پارٹیاں، طلبا تنظیمیں، دانشور ادیب سب ملکر ان کے لیئے منظم جدوجہد نہیں کرتے۔

بلوچی زبان اور میڈیا

بلوچستان تین ملکوں ایران افغانستان اور پاکستان میں منقسم ہے۔ پاکستان میں بلوچستان کے علاوہ پنجاب، سندھ اور سرحد میں بلوچ علاقے شامل ہیں۔ بلوچی پسماندہ ترین زبانوں میں شمار ہوتا ہے۔ میڈیا کے حوالہ سے پہلے الیکٹرانک میڈیا کا ذکر کریں گے۔ ریڈیو موثر اور سب سے سستا ذریعہ ابلاغ ہے۔ جس کے لیئے نہ تو بجلی اور نہ بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ تقریباً ہر فرد کا اس تک رسائی ممکن ہے۔ ریڈیو سے موسیقی، خبریں اور دیگر پروگرامز کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ لیکن بلوچی زبان کے پروگرامز جو کوئٹہ ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں شاید کسی جگہ سنی جاتی ہونگی لیکن بروری میں جو کوئٹہ میں ہے سنائی نہیں دیتی۔ متعلقہ افراد سے پوچھنے پر جواب ملا کہ مشنری کافی پرانی ہے شارٹ ویوز پر کوشش کر کے دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ خضدار ریڈیو سٹیشن سے آدھا گھنٹہ صبح اور آدھا گھنٹہ شام بلوچی پروگرامز نشر ہوتے ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تربت ریڈیو سٹیشن کی نشریات بھی محدود علاقے تک سنی جاتی ہے۔ پی ٹی وی بولان جس کی نشریات گو کہ صرف دو گھنٹے کی ہوتی ہیں پھر بھی غنیمت ہے۔ سبی ریڈیو سٹیشن میں ایک چوتھائی کلوواٹ کی پاکٹ ٹرانسمیٹر نصب ہے اسکی نشریات آٹھ، دس کلومیٹر تک سنی جاتی ہیں اور اسلام آباد سے صرف اردو خبریں صبح، شام ریلے ہوتی ہیں۔ سبی ریڈیو سٹیشن کا خوبصورت عمارت شہر

کے بیچوں بیچ وسیع رقبہ پر بنی ہوئی ہے۔عملہ کی تعیناتی بھی ہو چکی ہے۔لیکن نا معلوم وجوہ کی بنا عوام نشریات کی باقائدہ آغاز کا گزشتہ بیس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔میں نے سردار فاروق خان لغاری، سردار یار محمد رند اور محترمہ زبیدہ جلال (جب وہ اقتدار میں تھے) کو سبی ریڈیو سٹیشن سے نشریات کے آغاز کی خاطر خطوط لکھے۔سردار لغاری اور محترمہ جلال نے متعلقہ ادارے کو لکھا اور مجھے کاپی دی لیکن سردار رند نے کسی کاروائی کو مناسب نہ سمجھا۔حالانکہ یہ انکا حلقہ انتخاب بھی ہے۔یہ علاقہ بلوچی ادب اور ثقافت کا مرکز ہے۔بلوچی زبان وادب کی بقا کے لیئے ضروری ہے کہ ریڈیو سٹیشن سبی سے نشریات کا جلد آغاز ہو۔جہاں تک پرنٹ میڈیا کی بات ہے مشرقی یعنی سلیمانی لہجہ میں ابھی تک کسی بھی جریدے کا اجرا نہ ہو سکا۔البتہ مغربی لہجہ میں تربت، کوئیٹہ، اور کراچی سے کئی ماہنامے نکل رہے ہیں۔روزنامہ آساپ کوئیٹہ کا ایک صفحہ دو دن بلوچی کے لیئے مختص ہے۔

۱۹۹۸ کی مردم شماری کے مطابق سبی نصیر آباد ڈویژن کی آبادی تقریباً بیس لاکھ تھی۔جسکی غالب اکثریت بلوچی بولتی ہے۔اسی مردم شماری کے مطابق جیکب آباد اور اندرون سندھ بائیس لاکھ بلوچ بلوچی بولتے ہیں۔ملحقہ ڈیرہ غازیخان اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے دامان اور پہاڑی علاقوں کے قبائل بھی بلوچی بولتے ہیں۔لیکن مشرقی بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سرحد کے ان بلوچوں کے لیئے جو مشرقی یا سلیمانی لہجہ بولتے ہیں کے لیئے ملک کے کسی بھی ریڈیو سٹیشن سے بلوچی پروگرامز نشر نہیں ہوتے۔کوئیٹہ اور خضدار ریڈیو سٹیشن کی نشریات کافی دور ہونے کی وجہ سے ان علاقوں

تک سنائی نہیں دیتیں۔اکیسویں صدی میں اتنی بڑی آبادی کو ریڈیو نشریات سے بھی محروم رکھنا نہ صرف ملکی قوانین کی بلکہ بنیادی انسانی حقوق کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔اس محرومی کے ازالہ کے لیئے خیر پور اور ملتان ریڈیو سٹیشن سے بلوچی کو مناسب وقت دینا چاہیئے اور بی ریڈیو سٹیشن میں ہائی پاور (۱۰۰ کلوواٹ) ٹراسمیٹر نصب کر کے باقائدہ نشریات کا آغاز کرنا چاہیئے۔اس کے علاوہ زبان سے محبت کرنے والے کسی بلوچ کے لیئے ایف ایم ریڈیو کی گنجائش ہر وقت موجود ہے۔کابل ریڈیو سے جو بلوچی پروگرام نشر ہوتے تھے طالبان نے انہیں بند کر دیا تھا، جو ابھی تک شروع نہ ہو سکے۔ ریڈیو زاہدان سے بھی بلوچی پرام نشر ہوتا ہے۔

مادری زبان اور حکمرانوں کا رویہ

اُردو اور مقامی پاکستانی زبانیں

اس وقت دنیا میں تقریباً ۷۰۰۰ (سات ہزار) زبانیں بولی جاتی ہیں۔ان میں سے گیارہ زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد سو ملین سے زیادہ ہے، جو آبادی کا ۵۱ فیصد ہیں جنکی تفصیل یوں ہے۔

چینی (Mandarin) ۱۲۲۳ ملین ،انگریزی ۳۷۲ ملین، ہندی / اردو ۳۱۶ ملین، ہسپانوی ۳۰۴ ملین، عربی ۲۰۱ ملین، پرتگیزی، ۱۶۵ ملین، روسی ۱۵۵ ملین، بنگالی ۱۲۵ ملین، جاپانی ۱۲۳ ملین، جرمن ۱۰۲ ملین۔دنیا کی ۹۰ فیصد زبانیں صرف ۵، فیصد آبادی بولتی ہے،اور دنیا کی ایک تہائی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد، (ہزار) ۱۰۰۰ سے کم ہے،اور آدھی زبانیں بولنے والوں کی تعداد، دس ہزار (۱۰۰۰۰) سے کم ہے، آئندہ پچاس سالوں میں ایسی زبانوں کے ختم ہونے کا شدید خطرہ ہے،اس وقت بھی ہر ماہ ۲ سے ۳ زبانیں مر رہی ہیں۔

اب پاکستانی زبانوں کی بات کریں گے،اردو ھماری قومی اور ہندوستانی مہاجروں کی مادری زبان ہے۔اس کے علاوہ پاکستان کی بڑی مادری مقامی

زبانیں (Indiginous Languages) اور انکے بولنے والوں کی تعداد ۲۰۰۱ کے مردم شماری کے لحاظ سے اس طرح ہے۔ پنجابی ۴۴.۱۵ فیصد، سندھی ۱۴.۷۰ فیصد، پشتو ۱۵.۴۲ فیصد، سرائیکی ۱۰.۵۳ فیصد، اردو ۷.۸۰ فیصد، براہوئی/بلوچی ۴.۵۷ فیصد، دیگر زبانیں ۴۴.۱۵ فیصد۔

انڈی جینس زبانیں وہ ہوتی ہیں جن کے بولنے والے قدرتی طور ایک خطہ زمین کے مالک ہوتی ہیں، محمد علی جناح نے ۴ فروری ۱۹۴۸ کو ڈھاکہ میں اعلان کیا تھا کہ اردو اور فقط اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی، شاید انکا خیال ہو کہ اردو مقامی زبان نہیں اس لیئے مقامی زبانیں بولنے والے اسے تسلیم کرلیں گے، پنجابی، سندھی اور پشتو بولنے والوں نے کوئی خاص مخالفت ظاہر نہ کی، لیکن بنگالیوں نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کیا، اس فیصلے سے نہ صرف بنگالیوں کی اپنی زبان کے ساتھ محبت کے جذبات مجروح ہوئے بلکہ یہ انکے معاشی امکانات اور سیاسی مواقع کا بھی سوال تھا، بنگالی مڈل کلاس زبان کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی، بابائے اردو مولوی عبدالحق بنگالیوں کو اردو کے حق میں راضی کرنے ڈھاکہ گئے اور تقریر کی کہ خداوند کی پسندیدہ زبانیں وہ ہیں جو دائیں سے بائیں لکھی جائیں، جیسے اردو، عربی، فارسی وغیرہ۔ اگلے دن بنگالیوں نے ڈھاکہ میں تمام اردو بورڈ توڑ کر بنگالی زبان کے بورڈ لگا دیئے۔

جب جنوری ۱۹۵۲ میں دستور ساز کمیٹی نے اردو کو واحد سرکاری زبان بنانے کی سفارش کی ۲۱ فروری کو ڈھاکہ کے طلبا نے بنگلہ زبان کے حق میں جلوس نکالا، جلوس

یاداشت پیش کرنے وزیر آعلی ہاؤس کی طرف بڑھا، ڈھاکہ میڈیکل کالج کے پاس پولیس نے فائرنگ کی ۵ طلبا شہد ہوگئے، ۲۲ فروری کو شہیدوں کے جنازے کے جلوس پر پھر گولی چلائی گئی چار مزید بنگالی بنگلہ زبان پر قربان ہو گئے، ۲۳ فروری کی رات ڈھاکہ میڈیکل کے طلبا نے راتوں رات ,,شہید مینار،، کے نام سے ایک یادگار قائم کی، جسے مارچ ۱۹۷۱ میں فوجی کاروائی کے دوران گرا دیا گیا، اقوام متحدہ کے ادارے یونسکو نے اسی مناسبت سے، ۲۱ فروری کو مادری زبانوں کا دن قرار دیا، اس طرح ۔۴ فیصد کی زبان کو، ۵۴ فیصد کی زبان پر فوقیت دیکر بنگلہ دیش کی بنیاد رکھ دی گئی ، پھر جب ۱۹۷۳ کا آئین بنا اور سندھی کو اردو کے ساتھ سرکاری زبان قرار دیا گیا، تو اُردو بولنے والوں نے سندھ بھر میں ہنگامے کئے، جنگ اخبار نے ماتمی ایڈیشن نکالے جن کے کناروں پر لکھا تھا ,, اردو کا جنازہ ہے ذرا، دھوم سے نکلے، لیکن بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیکر اور ماررری زبانوں کو ذریعہ تعلیم نہ بنا کر فاش غلطی کی جسکا حال ہی سردار عطا اللہ مینگل نے اپنے انٹریو میں اعتراف بھی کیا۔ اس سے قبل لیاقت علی خان نے کراچی کے، ۱۳۰۰ سندھی سکول بند کر دیئے اور سندھ یونیورسٹی کو کراچی سے حیدر آباد لایا گیا اور سندھی زبان کو کراچی سے مکمل بے دخل کر دیا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے پاکستان آکر علی اعلان کہا بلکہ لکھا کہ ''پاکستان میں اُردو واحد اسلامی زبان ہے، باقی سب زبانیں بت پرستوں اور کافروں کی ہیں'' دنیا میں ہر جگہ اکثریتی زبان اقلیتی زبانوں کے لیئے خطرہ بن جاتی ہے، لیکن

ہمارے ملک میں ایک چھوٹی اقلیت، جو مہاجر ہے کی زبان اکثریتی زبانوں پر اس حد تک حاوی ہے کہ وہ اپنی بقا کی جدوجہد بھی نہیں کر پا رہے۔

مقامی زبانوں کو ایک اور سنگین خطرہ ان کے بولنے والوں کا اقلیت میں چلے جانا ہے۔ بلوچستان، سندھ، اور فرنٹیئر میں اسلامی بھائی چارے کے نام پر لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی، برمی، بنگالی اور افغان مہاجرین کو لا کر آباد کئے گئے، بنیادی مقصد چھوٹی قومیتوں کو یہاں تک کمزور کرنا ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بات کرنے کے قابل نہ رہیں۔ بلوچی وہ زبان ہے، جس کے مٹنے کا خطرہ سب سے زیادہ ہے، بلوچ قوم تین ملکوں ایران افغانستان اور پاکستان میں تقسیم ہیں اور پاکستان میں بلوچستان کے علاوہ سرحد، پنجاب اور سندھ میں بلوچ علاقے شامل ہیں، اور بلوچی ہر جگہ سرکاری سرپرستی سے محروم ہے۔

چھوٹی قومیتوں کی زبان اور ثقافتوں کو نظر انداز کرنے کے دو وجوہات ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ حکمران انہیں ہر صورت اقتدار کے دائرے سے باہر رکھنا چاہتے ہیں، جس میں وہ گزشتہ ۶۰ سال سے کامیاب چلے آرہے ہیں، دوسرا یہ کہ بعض حکمران حلقوں کی شروع سے یہ سوچ ہے وہ قومی یک جہتی اور استحکام کو یکسانیت میں ڈھونڈ رہے ہیں، جیسے ایک قوم، ایک زبان، ایک ثقافت اور تاریخ وغیرہ، جو اکیسویں صدی میں قرون وسطیٰ کی پسماندہ ذہنیت کی عکاس ہے۔ بین الاقوامی ماہرین آج اس بات پر متفق ہیں کہ قوموں میں نفاق کی وجہ زیادہ زبانوں کا استعمال نہیں بلکہ

مفادات کا ٹکراؤ ہے، زبانوں کو تاریخ اور ثقافت کے بے بہا خزانے کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ بڑی زبان کی ترقی کی بجائے بہت سی زبانوں کی ترقی ثقافتوں کے درمیان برداشت کی ضمانت ہوتی ہے۔ سویت روس کے ٹوٹنے کے بعد مشرقی یورپ میں نسلی فسادات کی وجوہات معلوم کرنے کے لیئے یورپی یونین نے اسکالرز کی ایک تحقیقی کمیشن بٹھائی، اسکی تجاویز کو ھیگ تجاویز کا نام دیا گیا، انہوں نے نسلی فسادات کی بنیادی وجہ قومی جبر کو قرار دیا، اور تجویز دی کہ چھوٹی قوموں کو اپنی شناخت کے تحفظ کا پورا حق ہے اور یہ اسوقت ممکن ہے جب انکی مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی قوموں کے افراد کی بھی ذمہ داری ہے کہ ریاست کی زبان پڑھیں تا کہ وہ وسیع قومی معاشرے کا حصہ بن سکیں۔

مادری زبان میں تعلیم، عالمی تناظر میں

اقوام متحدہ کے ادارے یونسکو نے ۱۹۵۱ء میں مادری زبان میں تعلیم کو بچوں کا حق قرار دیا۔ اس قرارداد پر تمام ممبر ممالک نے دستخط کیئے جن میں پاکستان بھی شامل تھا، اسوقت دنیا کے اکثر ممالک میں اس پر عمل ہورہا ہے، ہندوستان میں اسی (۸۰) سے زیادہ مادری زبانوں میں تعلیم دی جارہی ہے اور وہاں ہر ریاست کی زبان قومی اور سرکاری ہے۔ اب وہ دور دراز چھوٹے چھوٹے بکھرے قبائل کے علاقوں کے بچوں کو بھی انکی زبان میں تعلیم دینے کی کوششوں میں ہیں۔ ان کے تعلیمی پروگرام میں لسانی اور ثقافتی تنوع (Diversity) کو مجوعی قومی ثقافتی ذرخیزی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں اسوقت گیارہ قومی زبانیں ہیں، آزادی سے قبل صرف دو زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ آج ترقی یافتہ دنیا نے چھوٹی چھوٹی قومیتوں اور گروہوں کے لسانی حقوق کا مکمل تحفظ کیا ہوا ہے، ہر ملک میں بچے ابتدائی تعلیم مادری زبان میں حاصل کررہے ہیں۔ پھر قومی اور بین القوامی زبان بتدریج مراحل میں سیکھتے ہیں، ان ممالک میں مہاجر بچوں کے لیے بھی مادری زبان میں تعلیم کا مکمل انتظام ہے، کینیڈا کی دو قومی زبانیں فرانسیسی اور انگریزی ہیں، وہاں ریڈ انڈین جو آبادی کا ایک فیصد ہیں۔ انکی

آبادی پھیلی ہوئی اور ہر قبیلے کی زبان بھی جدا ہے، کے بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جارہی ہے۔ ناروے میں ستر (۷۰) زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں اردو بھی شامل ہے، اوران سب زبانوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام موجود ہے ۱۹۹۱ میں امریکہ کے محکمہ تعلیم نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں کہا گیا کہ ابتدائی درجوں میں بچوں کی مادری زبان پر اسکول میں جتنی توجہ دی جائے بچے بعد میں اتنا انگریزی زبان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو زبانیں سیکھنے سے بچے اور بھی کئی طرح سے فائدہ مند ہوتے ہیں۔

سماجی عزت، وقار اور روزگار کے مواقع ریاستی اور بین القوامی زبان کے جاننے سے حاصل ہوتی ہیں مگر پھر بھی تعلیمی ماہرین مادری زبان پر زور دے رہے ہیں، یونسکو کہتی ہے اس کے تعلیمی ماہرین سالوں کی انتھک محنت اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مادری زبان تعلیم کے لیئے سب سے اچھی زبان ہے۔ اور خاص طور ابتدائی درجوں میں، اس کی کئی وجوہات بیان کی گئیں جس میں کسی قوم یا لسانی گروہ کی زبان ثقافت اور تشخص کے علاوہ بچوں کی تعلیمی استعداد پر اس کے بے پناہ مثبت اثرات کا مرتب ہونا ہے۔ پانچ سال کی عمر میں بچے کا ذھن نشوونما کے ابتدائی مراحل میں ہوتا ہے، جتنا ممکن ہو اس پر کم سے کم بوجھ پڑنا چاہیئے، دوسری زبان میں پڑھنا اس کے لیئے ذھنی دباؤ اور کوفت کا باعث بنتا ہے، مادری زبان میں تعلیم سے بچے کو سکول میں اپنے گھر جیسا ماحول میسر ہوتا ہے اور اسے اجنبیت کا احساس نہیں

ہوتا، اس کے علاوہ بچہ ایسی زبان سے ابتدا کر رہا ہوتا ہے جس کے علم کا ایک ذخیرہ پہلے سے ہی اس کے پاس ہے، اس لیئے ابتدا کرنے میں اسے دقت پیش نہیں آتی بلکہ جن چیزوں کے بارے میں اسے پہلے علم ہوا نکے پڑھنے سے بوریت کی بجائے اسے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیئے مادری زبان کی تعلیم سے بچوں کے اسکول چھوڑنے کی شرح میں حیرت انگیز کمی دیکھنے میں آئی۔ یونسکو کہتی ہے مادری زبان کی تعلیم دنیا میں ایک سو تیس (۱۳۰) ملین سے زیادہ ان بچوں کی جو ابھی تک اسکول سے باہر ہیں کی تعلیم تک رسائی کی بنیادی حکمت عملی ہے جس پر عمل ہونا باقی ہے۔ مادری زبان کی تعلیم کے بارے میں یونسکو کا کہنا ہے۔

(To reject a childs language in school where he goes to study amounts to reject the child himself. He at once senses this rejection and is less likely to participate confidently in classroom activities.)

ترجمہ: ''سکول جس میں بچہ پڑھنے جاتا ہے اسکی مادری زبان کو رد کرنا، خود بچے کو رد کرنے کے مترادف ہے وہ یکدم اس، رد کرنے کے عمل کو محسوس کر لیتا ہے اور آئندہ کبھی کلاس روم کی سرگرمیوں میں اعتماد سے حصہ نہیں لیتا،، جب ایک بچے کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اسکی زبان کمتر ہے یعنی اس میں تعلیم نہیں دی جا سکتی اس لیئے آپ کو دوسری زبان میں تعلیم دی جا رہی ہے، تو دراصل اسے یہ پیغام دی جاتی ہے کہ وہ خود کمتر ہے، یہ بتا کر بچے کو منفی تصور دیا جاتا ہے۔ کہ جس ''ثقافتی سرمائے'' سے اس کا تعلق ہے وہ دراصل سر مایہ نہیں بلکہ شرمندگی کا بوجھ ہے جو وہ اٹھائے پھرتا ہے، یہ سلوک بچے کو اپنی قومی

شناخت، قومی ورثہ، تاریخ اور ثقافت کے ہر پہلو سے منکر ہونے کے لیئے تیار کرتا ہے اور بچے میں اسکی اپنی حقیقی شناخت کے اہم پہلوؤں سے شرمندگی کی احساس کو جنم دیتا ہے۔ اسی لیئے چھوٹی اور کمزور قومیں گروہ، طبقے، کمیونیٹیز اور صنف، اپنی شناخت کے اہم پہلوؤں سے شرمندہ ہوتی ہیں۔

کسی بھی تعلیمی پروگرام میں زبان کا انتخاب بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مادری زبان میں بہت پیچیدہ انسانی تہذیبی، اور تمدنی پہلو متعلق ہوتے ہیں۔ بچوں میں اس کے اثرات آگاہی اور نفسیاتی بالیدگی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ بڑوں میں اس کے اثرات معاشرے میں سیاست، معیشت اور معاشرتی زندگی میں حصہ لینے کی اہلیت بڑھاتی ہیں۔ یونسکو اپنی ایک رپورٹ میں کہتی ہے۔

"Years of research have shone that children who begin their education in their mother tongue make a better start and continue to perform better than those for home school starts with a new language.This conclution is now widely implemented,although we still hear of Governments that insist on imposing a foreign language of instruction on young children,either in a mistaken attempt at modernity or to express the pre-eminence of a social dominant group".

ترجمہ: برسوں کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ جو بچے اپنی مادری زبان سے تعلیم کی ابتدا کرتے ہیں، شروع سے ہی انکی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور انکی یہ اچھی کارکردگی مسلسل قائم رہتی ہے بہ نسبت ان بچوں کے جو اپنی تعلیم ایک نئی زبان سے شروع کرتے

ہیں اب اس نتیجہ پر ہر کہیں عمل ہو رہا ہے، اگر چہ ہم اب بھی ایسی حکومتوں کے بارے سنتے ہیں جو چھوٹے بچوں پر اجنبی زبان تھوپنے پر اصرار کرتے ہیں، وہ ایسا یا تو غلطی سے جدیدیت کی خاطر کر رہے ہوتے ہیں یا سماجی طور پر حاوی گروہ کی زبان کو فوقیت دینے کی خاطر،،۔

یونیسکو کے مطابق:

(Education has the power to transfer people and countries alike,because it is the wellspring of equality,ability,social qpertunity,economic stability, and national progress.UNESCO).

ترجمہ:۔ تعلیم ہی وہ طاقت ہے جو لوگوں اور قوموں کو برابری کی سطح دلا سکتا ہے، کیونکہ تعلیم برابری، انسانی صلاحیت، معاشرتی مواقعوں، معاشی استحکام اور قومی ترقی کا سر چشمہ ہے۔

مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

قدرتی خزانوں سے مالا مال سرزمین کے مالک ہونے کے باوجود بلوچ تینوں ممالک میں پسماندہ اور مظلوم ہے بلوچ سرزمین کو اتنا پسماندہ رکھا گیا کہ کہیں بھی اسکی اپنی مارکیٹ وجود میں نہ آسکی انکے علاقے میں جو شہر آباد ہوئے، بلوچ کی بجائے ان پر درآمد نے غلبہ حاصل کی اور انہیں کی زبان مارکیٹ پر حاوی ہوگئی جیسے کراچی، خان گڑھ، ڈیرہ غازی خان، کوئیٹہ زاہدان، اسکی بنیادی وجہ ان ممالک کے حکمرانوں کا بلوچوں کی حق حکمرانی اور حق ملکیت سے انکار ہے، قومی محکومی کے ساتھ بلوچی زبان کا شمار بھی ان پسماندہ زبانوں میں ہے جن کے مٹنے کا خوف ہے، زبان کے مٹنے کے ساتھ اس کے بولنے والے بھی اپنی حیثیت کھو دیتے ہیں اسکی مثال بھی سندھ، پنجاب اور سرحد کے بلوچ ہیں آج ان میں بلوچیت کا احساس باقی ہے، بلوچی جو انکی قومی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ انکے ڈاڈا کی بھی زبان رہی ہے کو دوبارہ سیکھنے کی بجائے انکی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بلوچ جو ابھی تک بلوچی بولتے ہیں، اپنی زبان ترک کر کے سندھی سرائیکی سیکھیں، اور اپنائیں، پاکستان میں بلوچی اپنے جائز مقام سے محروم چلا آرہا ہے اسکی ایک وجہ تو اس مخصوص گروہ کی سوچ ہے جسکا اقتدار پر شروع سے قبضہ ہے، وہ ایک

ملک ،ایک مذہب،ایک قوم ،ایک زبان ایک ثقافت کے نظریہ کے قائل ہیں،اور دوسری وجہ ہماری اپنی کمزوریاں ہیں، حالانکہ ملکی آئین میں پاکستانی زبانوں کو مکمل تحفظ اور ترقی کی ضمانت دی گئی ہے آرٹیکل ۲۸ میں لکھا ہے:

(Subject to article 251 any section of citizen having distinct language,script or culture shall have the right to preserve and promo the same and subject to law establish institution for that purpuse

ترجمہ: آرٹیکل (۲۵۱) کے مطابق شہریوں کا کوئی بھی گروہ جنکی زبان، رسم الخط، یا ثقافت مختلف ہوانکو حق حاصل ہے کہ اسکی تحفظ کریں اور اسے ترقی دیں اور اس مقصد کے لئے قانون کے مطابق ادارے قائم کریں،

آئین آرٹیکل (۲۵۱) سب سیکشن (۳) میں لکھا ہے۔

(With out prejudices to the status of national language a provicia Assembly may by law priscribe measures for the teaching promotior and use of a provincial language in addition to national language)

ترجمہ: ''قومی زبان کے مرتبہ سے بدگمانی پیدا کئے بغیر ایک صوبائی اسمبلی کو قانونی اختیار ہے کہ وہ قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کو پڑھانے اور اسکی ترقی کے لیئے اقدامات تجویز کرے''

اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق مادری زبان میں تعلیم بچوں کا بنیادی حق ہے، تعلیمی ماہریں کے مطابق مادری زبان میں تعلیم سے نہ صرف بچوں میں خود اعتمادی بڑھتی ہے بلکہ انکی تحقیقی اور تخلیقی استعداد میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور یہ کہ جو بچے مادری

زبان میں تعلیم پاتے ہیں، عملی زندگی میں دوسروں کے مقابلے میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، جہاں بھی مادری زبان میں تعلیم شروع کی گئی سکول چھوڑنے کی شرح میں حیرت انگیز کمی دیکھنے میں آئی۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں میں نے عربی زبان میں قرآن کا نزول کر کے عربوں پر احسان کیا تا کہ وہ اس کتاب کو اچھی طرح سمجھیں، یونیسف کے مطابق مادری زبان کی تعلیم دنیا میں، ایک سو تیس (۱۳۰) ملین سے زیادہ ان بچوں کی جو ابھی تک سکول سے باہر ہیں کی تعلیم تک رسائی کی بنیادی حکمت عملی ہے، ہندستان میں اسوقت اسی (۸۰) سے زیادہ مادری زبانوں میں تعلیم دی جارہی ہے آج ماہرین۔ لسانی، نسلی تنوع (divercity) کو علمی ادبی اور ثقافتی ذخیرہ کے طور دیکھتے ہیں، کوئی زبان چاہے جتنا چھوٹا کیوں نہ ہو، پوری انسانیت کی میراث ہوتی ہے، اس کے مٹنے کا مطلب ہے دنیا کی رنگینی سے ایک رنگ کا مٹ جانا، بدقسمتی سے ہمارے ملک میں لسانی، ثقافتی تنوع کو ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی سے متصادم تصور کیا جاتا ہے، یورپ اور امریکہ میں اگر کہیں یک زبان مہاجر بچے ہوں قانون کے مطابق مادری زبان میں انکی ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے، کینیڈا اور امریکہ میں ریڈ انڈین کے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دی جارہی ہے اس کے باوجود کہ انکی آبادی قلیل اور بکھری ہوئی ہے، اور جنکی زبان بھی ایک سے زیادہ ہوتی ہیں۔ زبان قومی تشخص اور ترقی کی بنیاد ہے، اور اسکی حکومتی سطح پر استعمال اسکے بولنے والوں کے لیئے انگنت مواقع پیدا کرتی ہے، آج بلوچی پڑھنے والے نہیں ملتے اخبار، جرائد بند ہوجاتے ہیں، جب بلوچی میں تعلیم ہوگی چار،

پانچ لاکھ بلوچی پڑھنے والے ہونگے تو وہ اخبار، جرائد خریدیں گے انہوں نے جس رسم ا لخط اور املا میں پڑھا ہوگا، لکھنے والے بھی اسی طرح لکھنے پر مجبور ہونگے، پرائمری تک مادری زبان اور قومی دونوں زبانیں پڑھائی جائیں، اس کے بعد بین الاقوامی زبان انگریزی شامل ہو، سائنس کے مضامین انگریزی اور دوسرے مضامین مادری اور اردو میں ہوں، کئی زبانوں میں تعلیم کا یہی طریقہ کار دنیا میں رائج ہے، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بچوں اور اساتذہ کی مادری زبان ایک ہی ہے، نہ کلچر کا مسئلہ ہے نہ انہیں پڑھانے میں کوئی دقت ہوگی، رضا کارانہ طور کوئی بھی حکومت مادری زبانوں کو تعلیمی زبان قرار دینے دکھائی نہیں دیتی، اس کے لیئے شعور اجاگر کرنے اور رائے عامہ ہموار کرنے، ایک عوامی مہم چلانے کی ضرورت ہے، جب تک ادبی تنظیمیں، دانشور، سیاسی ورکر اور طلبا لاتعلقی کا سمجھ میں نہ آنے والا رویہ ترک کر کے حکومت پر دباؤ نہیں ڈالیں گے، کوئی حکومت راضی نہیں ہوگی۔

زبان اور قومی شناخت

ہر زبان کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ثقافت کسی قوم یا لسانی گروہ کی رسم ورواج ،تاریخ ،اقدار اور نفسیات کا نام ہے۔زبان کسی قوم کی شناخت کی علامت ہوتی ہے۔اس شناخت کو بچانے کا واحد ذرایعہ مادری زبان کی تعلیم ہی سے ممکن ہے۔ہر زبان کو چاہے چھوٹی ہو یا بڑی تاریخ اور ثقافت کے بے بہا خزانے کی طرح دیکھنا چاہیئے۔زبان ہی ہے جو ثقافتی اقدار کو ایک نسل سے دوسری نسل،ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا دریعہ ہے۔لسانی اور ثقافتی تنوع (Diversity) بنی نوع انسان کی مشترقہ میراث ہے۔اور یہ تنوع ہمارے لیئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ فطرت کے لیئے بائیوڈائیورسٹی (Bio-Diversity)۔دنیا میں امن ہم آہنگی اور خوشحالی کی خاطر لسانی اور ثقافتی تنوع کی ہمیشہ عزت کرنی چاہیئے۔اسے نہ ماننا، اسکی بیخ کنی کرنا غیر فطری عمل ہے۔بدقسمتی سے ہمارے ملک میں شروع سے بولی جانے والی زبانوں اور ثقافتوں کو قومی تشکیل کے منافی سمجھا گیا اور قومی بقا یکسانیت میں تلاش کی جانے لگی۔تعلیمی اداروں اور میڈیا کے ذریعے ایک قوم یعنی مسلمان قوم،ایک زبان یعنی اردو،ایک ثقافت یعنی اسلامی ثقافت کے فلسفے کو فروغ دیا گیا۔دراصل قابض حکمران اپنی اقتدار کو دوام دینے کی خاطر یہ سب کرتے رہے۔انہوں نے حب الوطنی اور اسلام کو اپنے حق میں بے دریغ استعمال کیا۔اختلاف کرنے والے ملک دشمن اور ملحد ٹھہرے۔اس طرح اردو کے علاوہ ملک میں بو لی جانے والی تمام زبانیں اور ثقافتیں پاکستانیت کی زد میں آگئیں۔جعلی نظریوں کی یلغار

نے ہمارا رشتہ اپنی زبان، ثقافت، اقدار اور روایات سے توڑ دیا۔ حکمران جانتے ہیں کہ زبان ہی وہ آلہ ہے جو لوگوں کو متحد کر سکتی ہے۔ اور اتحاد سے وہ اپنی ثقافت۔ تاریخ اقدار اور رسم رواج کو قائم رکھ سکیں گے اور اپنے معاشی حقوق لینے کے قابل ہونگے۔ اس لیئے انہوں نے زبانوں اور ثقافتوں کو فرسودہ اور گھسا پٹا قرار دیکر ایسے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی جو لوگوں کو مہذب بنانے کی آڑ میں ایسے کھیپ تیار کرنے لگی جو ہیں تو مقامی لیکن زبان ثقافت اور نفسیات کے اعتبار سے اپنے آقاؤں سے قطعی مختلف نہیں ہیں۔ اسی لیئے آج تشخص کے بحران نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ مذہبی جنونیت فرقہ واریت، افرا تفری۔ اقربا پروری، بدعنوانی اور بدانتظامی اگ آنے والی وہ فصل ہے جسکی کاشت حکمران برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ زبانوں اور ثقافتوں کے بارے اقوام متحدہ کا ادارہ یو نسکو کہتی ہے۔

Languages and identity are linked as the term mother tongue implies .A healthy identity balances different expects of our personality community expresses part of its identity in its language of instruction,and a healthy society makes choices that promote harmonious communities and confidential individuals.(UNESCC

ترجمہ:۔ جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے زبان اور شناخت آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ایک تندرست شناخت ہی ہماری شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو متوان رکھتی ہے۔ ہر کمیونٹی اپنی شناخت کے ایک حصے کا اظہار بولی جانے والی زبان میں کرتی ہے ایک صحت مند سوسائیٹی ''انتخاب'' کے حق کا احترام کرتی ہے۔ جس سے ہم آہنگ کمیو نٹیز اور پر اعتماد افراد کی پرورش ہوتی ہے۔

حصہ دوئم

Languages and identity are linked as the term mother tongue implies ,a healthy identity balances different expects of our personality .A community expresses part of its identity in its language of instruction,and a healthy society makes choices that promote harmonious communities and confidential individuals.(UNESCO)

ترجمہ:۔ جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے زبان اور شناخت آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ایک تندرست شناخت ہی ہماری شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو متوان رکھتی ہے۔ ہر کمیونٹی اپنی شناخت کے ایک حصے کا اظہار بولی جانے والی زبان میں کرتی ہے ایک صحت مند سوسائیٹی ''انتخاب'' کے حق کا احترام کرتی ہے۔جس سے ہم آہنگ کمیونٹیز اور پر اعتماد افراد کی پرورش ہوتی ہے۔

۲۰۰۸ زبانوں کا عالمی سال

(یونسکو (UNESCO) کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر ماٹسورا کا پیغام)

آنے والی دہائیوں میں بنی نوع انسان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا انکا مقابلہ کرنے کے لیئے زبانوں کی فیصلہ کن اہمیت سے اقوام متحدہ مکمل آگاہ ہے۔اسی لیئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے سال ۲۰۰۸ کو زبانوں کا سال قرار دیا۔زبانیں افراد اور گروہوں کی شناخت ان کے درمیان پرامن بقاءباہمی کے لیئے بے حد اہم ہیں۔یہ پائیدار ترقی مقامی اور بین الاقوامی سطح پر لوگوں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی جانب پیش رفت کے لیئے بھی بنیادی حکمت عملی ہیں۔"تعلیم سب کے لیئے" کے چھ مقاصد اور میلینیم ڈیولپمنٹ گولز (Millennium Developmet Goals) جن پر اقوام متحدہ ۲۰۰۲ء میں متفق ہوئی۔کے حصول کے لیئے زبانوں کا کردار بے حد اہم ہے۔چونکہ زبانوں کا کردار سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں کلیدی ہے،اس لیئے بے انتہا غربت اور بھوک کے خاتمے (ایم ڈی جی ۱) میں یہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔یونیورسل پرائمری تعلیم (ایم ڈی جی ۲) برائے علم وآگاہی اور کامیاب زندگی کے ہنر کے حصول کے لیئے زبانوں کا کردار بنیادی ہے۔ایچ آئی وی رایڈز،ملیریا اور دوسری

بیماریوں (ایم ڈی جی ٦) کا مقابلہ کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ متعلقہ کمیونٹی جس میں کام ہورہا ہو، کی آگاہی کے لیئے انکی زبان استعمال ہو۔ دساوری علم وادب کی حفاظت اور ماحول کی برقراری (ایم ڈی جی ٧) کی ضمانت حقیقی طور پر مقامی اور دیسی زبانوں سے جڑی ہوئی ہے۔

جیسا کہ ثقافتی تنوع (diversity) کے بارے یونسکو کا عالمی اعلامیہ اور لائحہ عمل ٢٠٠١ء اور ثقافتی ورثہ کی حفاظت، ثقافتی تنوع کے اظہار کی حوصلہ افزائی وترقی کی کنونشن ٢٠٠٥ء میں بیان ہوا کہ ثقافتی تنوع لسانی تنوع سے منسلک ہے۔ بحر حال چند پشتوں میں سات ہزار زبانیں جو دنیا میں آج بولی جارہی ہیں، میں سے پچاس فیصد سے زیادہ ختم ہوسکتی ہیں۔ فی الوقت ان میں سے ایک چوتھائی سے بھی کم سکولوں اور سائیر سپیس میں استعمال ہورہی ہیں اور وہ بھی کبھی کبھار۔ ہزاروں زبانیں نظام تعلیم، میڈیا، پریس، اور عوامی حلقوں (Public Domain) سے غائب ہیں اس کے باوجود کہ انکے بولنے والوں کو ان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ کیسے؟ ہمیں زبان کے بارے ایسی حکمت عملی اور پالیسیاں تشکیل دینی چاہیں جو ہر کمیونٹی کی حوصلہ افزائی کرے اور اسے اس قابل بنائیں کہ وہ اپنی مادری زبان کو جتنا ممکن ہو بشمول تعلیم کے وسیع پیمانے پر اور اکثر اوقات استعمال میں لاسکے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قومی یا علاقائی اور ایک بین الاقوامی زبان پر بھی عبور حاصل کرے اور اسی طرح حاوی زبان بولنے والوں کو ایک قومی یا مقامی اور ایک بین الاقوامی زبان پر مہارت حاصل کر

نے کی حوصلہ افزائی ہو۔ ہماری گلوبل دنیا میں تمام زبانیں صرف اسوقت اپنی مناسب مقام پاسکیں گی جب کثیر اللسانیت کو مکمل طور قبول کرلیا جائے گا۔ اسی لیئے یونسکو حکومتوں، اقوام متحدہ اور سول سوسائیٹی کی تنظیموں، تعلیمی اداروں، پیشہ ور انجمنوں اور تمام وابستہ لوگوں کو دعوت دیتی ہے کی وہ زبانوں اور خاصکر مٹنے کے خطرے سے دوچار زبانوں کی انفرادی اور اجتمائی صورت عزت کریں اور انکی ترقی اور تحفظ کی خاطر اپنی کوششیں تیز تر کریں، ایسی کوششیں ان زبانوں میں تعلیم یا سائیبر سپیس میں کام کے آغاز، تعلیمی ماحول عام کرنے، خطرے میں گھری زبانوں کے تحفظ کے منصوبوں، سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں زبانوں کی کردار پر کام، زبان اور معیشت کے مابین تعلق یا زبان اور تخلیق کے درمیان واسطہ ڈھونڈ نے کی صورت ہو سکتی ہیں۔ یہ اہم ہے کہ۔ ''زبان کا مقدمہ'' (Language Matter) کی ہر جگہ اور ہر وقت وکالت کی جائے۔

۲۱ فروری ۲۰۰۸ء جو زبانوں کی نویں عالمی دن ہے کی اس سال ایک خاص اہمیت ہوگی۔ اس دن زبانوں کی ترقی کے لیئے جو اقدامات اور فیصلے ہونگے وہ حتمی نوعیت کے ہونگے۔ ہماری مشترکہ منزل لسانی تنوع اور کثیر اللسانیت کی اہمیت کو تعلیمی اداروں، انتظامی اور عدالتی میدانوں، ثقافتی اظہار، میڈیا، سائیبر سپیس اور ٹریڈ میں قومی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر یقینی بنانا ہے۔ ۲۰۰۸ء بین الاقوامی سطح پر زبانوں کے سال کے طور پر منانا ان مقاصد کے حصول کی خاطر فیصلہ کن پیش رفت کا موقع فراہم کرے گا۔

ریاستی گرفت اور بلوچستان میں زبان پر اِسکا اثر

(State Controle and its Impact on Language in Balochistan.)

تحریر: کارینا جاہانی

اس مضمون کے لکھنے کا مقصد مشرق وسطیٰ کے سب سے کم زیر مطالعہ گروہوں میں سے ایک "بلوچ" جو ایرانی لسانی علاقے کے جنوب مشرقی کونے میں آباد ہیں کے سماجی لسانی حالات کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے یہ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ریاستی بالادستی کسی حد تک حال ہی میں قائم ہوئی اور جہاں جدید سماج، اس کی زر پرست معیشت، مستقل سکونتی طرز زندگی، عام تعلیم اور حکومتی نظم ونسق وغیرہ اب قائم ہو رہی ہیں۔ بلوچستان جیسے علاقے میں جہاں ابتک لوگ لسانی منصوبہ بندی تعلیم، ابلاغ عامہ، اخبار یا سرکاری زبان جیسی کوئی سوچ (phenomenon) نہ تھی۔ وہاں زبان سے متعلق ریاستی فیصلوں اور ان پر عملدرآمد کا مطالبہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ بحرحال ایران میں فارسی زبان اور پاکستان میں اردو اور انگریزی نے بلوچستان میں ایک مستقل پھیلتی کردار ادا کرنا شروع کیا۔ جسے کئی بلوچ اپنی زبان اور مخصوص نسلی شناخت کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ بلوچ جدیدیت کے خلاف نہیں لیکن بلوچ دانشور اس مشکل میں ہیں کہ کیسے اپنی زبان اور نسلی تنوع (diversity) کو برقرار رکھیں اور

ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی گلوبل دنیا میں بھی حصہ لیں۔

تاریخی پس منظر:۔انیسویں صدی کے آخر میں پاکستان اور ایران کے درمیان کھینچی لکیر جسے گولڈ سمتھ لائن کہتے ہیں بارڈر کمیشن جس کی سربراہی برطانوی جرنل گولڈ سمتھ کر رہے تھے جس میں تہران اور ریاست قلات کے نمائندے شامل تھے نے کھینچی تھی۔ یہ لائن قدیم بلوچ سرزمین کو تقسیم کرتی ہے جس پر دونوں طرف آباد بلوچ ابتداء سے مسلسل اعتراض اور اکثر اوقات اسے نظر انداز کرتے آرہے ہیں۔ (Breser2001,133.134)۔بے شک اس لائن نے لسانی مسئلہ پر کافی اثر ڈالا۔اس لیئے سرحد کے دونوں اطراف بلوچی زبان کی صورت حال کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ بلوچ کے ابتدائی تاریخ کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں لیکن دو بنیادی نظریے(theories)مشہور ہیں کہ وہ کب اپنی موجودہ جائے سکونت آئے جو جنوب مشرقی ایران ,جنوب مغربی پاکستان اور جنوبی افغانستان کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ مقامی نظریے کے مطابق آرین قبائل کی جاری نقل مکانی کے ساتھ، جو سطح مرتفع ایران پر شمال سے پہلے ہی چڑھائی کر چکے تھے مرکزی بلوچ (Core Baloch) دو ہزار سال قبل بلوچستان میں آباد ہو کر مقامی لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ہجرت نظریہ (Imigration Theory)جسے مقامی جنگی روایات کی پشت پناہی حاصل ہے جنکا تعلق شجرہ نسب کی رزمیہ شاعری اور بلوچ قبائل کی نقل مقانی سے ہے، کے مطابق بلوچ نزدیک دسویں صدی عیسوی کے لگ بھگ شمال مغرب سے بلوچستان

آئے۔ حقیقت میں یہ رزمیہ گیت بلوچ کو سامی نسل اور پیغمبر ﷺ سے قریبی رشتہ بتاتے ہیں۔ یہ تھیوری بلوچ کو ایک اچھا اور راسخ العقیدہ مسلمان ثابت کرنے کے لئے بناوٹی تاریخ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بلوچ کے دوسرے نسلی تعلق جیسے ترک اور انڈین کی بھی بات ہوئی (Dames1904-7)۔ ہوسکتا ہے بلوچ ابتدائی تاریخ میں مختلف قبائل پر مشتمل تھے۔ اور ان میں مشترکہ نسلی احساس نہ ہو۔ (spooner 1989;607) پھر بھی لسانی شوائد یہی بتاتے ہیں کہ کم از کم ایک مرکزی گروہ (Core Group) غالباً یورپی نسل سے تھا۔ جس نے شمال مغرب سے نقل مکانی کی تھی۔ عرب گروہوں نے شاہد اپنا راستہ ان مختلف النسل (Hetrogenous) قبائل میں ڈھونڈا ہو، اور یہ سب آخر کار باہم مدغم ہوکر کرمان کے مشرق میں بلوچ شناخت بنے۔ (spooner 1987;609) عرب تاریخ دان نویں, دسویں صدی عیسوی سے انکا تعلق کرمان خراسان سیستان اور مکران کے درمیانی علاقوں سے بتاتے ہیں۔ (spooner1989:606) یہ بھی ممکن ہے کہ بلوچستان میں آباد ہوتے وقت انہوں نے مقامی آبادی کا ایک بڑا حصہ اپنے اندر جذب کیا ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ انہیں ہمسایوں سے الگ رکھنے کے لئے ایک بلوچ نسل کی بات کی جائے۔ (Dames 1904) لیکن ایسے دوسرے عوامل ہیں جو انہیں باہم مربوط اور خطہ کے دوسرے لوگوں سے جدا کرتے ہیں۔ انتھونی ڈی سمیتھ (1986;21) ثابت کرتا ہے۔ کہ ایتھنوز (ethnos) کی اصطلاح بیالوجی اور خاندانی تفاوت کی

بجائے ثقافتی تفاوت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ان ثقافتی تفاوت میں سے وہ مشترکہ نام، نسب کا ایک مشترکہ افسانوی داستان، مشترکہ تاریخ ،ایک مخصوص مشترکہ ثقافت،ایک خطہ زمین سے وابستگی اور یکجہتی کی سوچ کوشمار کرتا ہے جونسلی وابستگی کے لازمی اجزا ہیں۔(smooth 1986:22-31) اور بلوچ کے بارے میں یہ تمام صحیح ہیں مشترکہ ثقافت کے اجزامیں سے زبان اور مذہب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

بلوچی زبان اور اسی طرح سنی مسلک انہیں ہمسایہ نسلی گروہوں سے نمایاں کرنے والے اجزاء ہیں۔ اپنے گروہ کا اِردگرد کے دوسرے نسلی گروہوں سے امتیاز کرنے کے قابل ہونا لازمی ہے۔حقیقت میں یہ امتیاز اپنے اور دوسرے گروہوں کے مابین ایسے عملی تعلق سے جوالگ محسوس کیئے جائیں، سے ممکن ہے۔جب اپنے گروہ کا ایک مستقل فرق دوسرے گروہ کے مدمقابل ہوتو پھر فائدہ مند ہوتا ہے۔(see e.g. Erikson 1993)۔ایران میں سنی مسلک اس لحاظ سے بنیادی ہے، جبکہ بلوچی زبان فارسی سے نزدیک ہے۔اور سرکاری موقف میں عام طورا سے فارسی کا لہجہ کہا جاتا ہے۔ جبکہ ایران میں اکثریت بلوچ کے برخلاف شیعہ اسلام کے پیروکار ہے۔دوسری طرف پاکستان میں جہاں بلوچی زبان، سندھی، لہندی، پنجابی، اردو یا دوسری ہندی زبانوں سے قُربت نہیں رکھتی۔اور مشرقی ایران زبان پشتو سے بھی کافی جُدا ہے، زیادہ بنیادی ہے۔جبکہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت اور بلوچوں کی بھی بڑی اکثریت سنی اسلام کے پیروکار ہیں۔

روایتی سماجی اقتصادی نظام بلوچستان کو دو حصوں شمال اور جنوب میں تقسیم کرتی ہے۔ شمال میں مالداری اور خانہ بدوشی رہن سہن کا غالب حصہ رہا ہے، جبکہ جنوب میں زراعت اور اس کے علاوہ بہت کم زمیندار، بے زمین مزدور یا غلام ملتے رہے ہیں۔ بلوچستان میں ہر جگہ قبائلی نظام ہی آزاد منش بلوچ کو تاریخی طور پر متحد رکھنے کی وجہ رہی ہے اور یہ غیر بلوچ قبائل اور پھلیوں کے لئے آسان تھا کہ وہ بلوچ قبائل کے ساتھ گھل مل جائیں اور انکے قبائلی نظام میں ضم ہوں۔ آجکل قبائلی نظام بہ نسبت اِن علاقوں کے جہاں مالدار خانہ بدوش رہتے ہیں، بلوچستان کے ان علاقوں میں جہاں روایتی معیشت بندوبستی زراعت (settled agriculture) پر مبنی ہے تیزی سے زوال پزیر ہے۔ اب یہ بھی سمجھا جارہا ہے کہ قبائلی وفاداریاں مضبوط قومی تحریک کے لیئے رکاوٹ ہیں۔ بہت سے بلوچ دانشور قبائلی وفاداریوں کو عام بلوچ قومی وفاداری میں بدلنے کی کوشش کررہے ہیں۔ (Smith 1986:21)

سترھویں صدی عیسوی میں بلوچوں نے علاقے کے دوسرے طاقتوں کے مقابلے میں براہوئی قبیلے کے ساتھ اتحاد کیا۔ یہ بلوچ، براہوئی خانیٹ جسکا مرکز قلات (آجکل کے پاکستان میں) تھا، 1947ء تک قائم رہا۔ یہ خانیٹ اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف نصیر خان اوّل کے دَور میں کافی طاقتور ہوگیا تھا۔ نصیر خان واحد خان تھا جو اپنے لوگوں کی وفاداریاں قبائل سے بلند کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ (Sponer 1989:611) لیکن بعد میں یہ ریاست کمزور پڑ گئی اور 1839ء

میں اسے برطانوی انتظام میں شامل کیا گیا۔ قلات کی سرکاری زبان شروع سے فارسی تھی۔ (Baloch 1987:120) لیکن بعد میں دفتری مقاصد کے لئے انگریزی نے فارسی کی جگہ لے لی۔

اُنیسویں صدی میں تہران کے قاچار شاہوں نے بلوچستان کے مغربی حصوں کو مطیع کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ اسی طرح برطانوی ہند بلوچستان کے مغرب میں پیش قدمی کی خواہشمند تھی۔ یہ گولڈ سمتھ بارڈر کمیشن کا پس منظر ہے اور اسکی حد بندی سے اکثر بلوچ وطن برطانوی ہند اور ایران میں تقسیم ہوگئی۔ اس کے باوجود قاچار کبھی بھی بلوچستان پر اپنی طاقت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ بعد میں 1928ء کی بات تھی جب نئی قائم ہونے والی پہلوی بادشاہت نے صوبے میں بالواسطہ کنٹرول حاصل کر لی۔

سرکاری لسانی پالیسی، تعلیم اور ذرائع ابلاغ کا اثر:

Official Language Policy and Impact of Education and Mass media:

جدید دَور سے قبل بلوچستان میں تعلیم روائتی اسلامی مدرسوں پر منحصر تھی۔ اس سسٹم میں بلوچی زبان اور لٹریچر کی تعلیم ممکن نہ تھی اور نہ بلوچی لٹریچر لکھنے کی پہلے کوئی روایت تھی کہ جس سے استفادہ کیا جاتا۔ استعمال ہونے والی زبانوں میں ایک عربی تھی جو مذہب اور سائنس کی زبان تھی۔ اور دوسری فارسی جسکی لمبی اور بلند ادبی تاریخ تھی۔

جدیدیت کے ساتھ سیکولر تعلیمی نظام اور قوم پرستی کا نظریہ پہلے برطانوی ہند اور پھر ایران پہنچا۔ حسین بور کے خیال میں سُست روی سے شہری زندگی اپنانا (slow pace of urbanization) سماجی اور معاشی زندگی میں جدیدیت کا فقدان اور 1960ء کی دہائی سے پہلے محدود حد تک جدید تعلیم کا متعارف ہونا وہ وجوہات ہیں جنکی وجہ سے بلوچ قومی تحریک کے سیاسی، لسانی اور ثقافتی مطالبات مشرقی بلوچستان (پاکستانی) کی نسبت مغربی بلوچستان (ایرانی) میں بہت سُست رفتاری سے آگے بڑھ پائے۔ اسکے علاوہ متشدد پہلوی حکمرانی بھی ایک وجہ تھی (Haussinbor 200:150) جب برطانوی ہند میں نوآبادیاتی زنجیریں توڑنے اور آزادی کے مطالبات زور پکڑنے لگے تو بہت سے تعلیم یافتہ بلوچ بھی آزاد بلوچستان کا مطالبہ کرنے لگے ان قوم پرستوں میں کچھ شاعر اور ادیب بھی تھے جنہوں نے بلوچی ادبی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انگریزوں نے پہلے ہی بلوچی زبان پر کافی توجہ دی ہوئی تھی۔ اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع سے بلوچی زبان کے مختلف لہجوں کی بہت سی گرائمر تشریح اور ڈکشنری کی کتابیں آ چکی تھیں۔ ایم لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچی زبانی رزمیہ شاعری، لوک داستانیں اور کہانیاں وغیرہ جمع کر کے شائع کیں۔ اِس نے بلوچی زبانی ادب (oral literature) پر بڑی تحقیق کی اور اِسے محفوظ کر کے بلوچی کی بڑی خدمت کی۔ بلوچی میں امتحان بھی منعقد ہوتے تھے۔ نوآبادکار سرکاری اہلکاروں کو بلوچی سیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ (Bruce 1900:69) 1930ء کی دہائی کے بعد جب

قوم پرست نوجوانوں نے بلوچی میں شاعری، مضامین اور دوسرے ادبی کام کرنے شروع کیئے تو پہلے سے موجود ان تحریروں سے انہیں مدد ملی۔ 1950ء کے وسط سے بلوچی میں کتابوں اور جرائد کی اشاعت کی اہمیت کو کبھی بھی کم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ اشاعت بھی کئی لحاظ سے بہت محدود ہیں۔ ایک تو علاقائی لحاظ سے اِن کی تقسیم زیادہ تر پاکستان تک محدود ہے۔ دوسرے اِن کے پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ تمام تعلیم یافتہ بلوچوں نے اپنی تعلیم اردو، انگریزی (پاکستان)، فارسی (ایران اور افغانستان) یا دوسری زبانوں جیسے عربی (خلیجی ریاستوں) میں حاصل کی۔ اِس کے علاوہ بلوچی ادبی تحریک کا انحصار مکمل طور پر ذاتی پہلکاریوں پر ہے۔ اِسے ذرا برابر سرکاری مدد حاصل نہیں۔ اِس لئے ایک چھوٹی سی ادبی اشرافیہ بلوچی کتب اور رسائل پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں مالی مشکلات درپیش ہیں (see e.g. Dashtyari 2003) پاکستان میں انتظامی اور تعلیمی میدانوں میں سرکاری سطح پر بلوچی استعمال نہیں ہوتی۔ اگرچہ بلوچی کو تعلیمی زبان قرار دینے کے لئے آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ پاکستان میں بلوچی کو جو سرکاری مدد حاصل ہے اِس میں بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں پڑھانا، ایک سرکاری اکیڈمی ''بلوچی اکیڈمی'' جس کی بنیاد 1961ء میں رکھی گئی اور ریڈیو، ٹی وی سے بلوچی نشریات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وزارت اطلاعات و نشریات کی جانب سے ایک میعادی (periodical) رسالہ ''اولس'' کا کوئٹہ سے اجراء بھی شامل ہے۔ 1990ء کے عشرے کے شروع میں پاکستانی بلوچستان کے اِن

علاقوں میں جہاں بلوچی بولنے والوں کی اکثریت ہے' پرائمری تک بلوچی پڑھانے کے اقدامات کیئے گئے تھے۔ بہرحال کئی وجوہ کی بنا یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ اِن میں بلوچوں کا اِملا کے مسئلے پر متفق نہ ہونا اور تجربہ کار اساتذہ کی کمی شامل تھی جو وجوہ زیادہ اہم تھا وہ شاید بلوچی بولنے والوں کا اپنی زبان کے بارے میں روّیہ ہے۔ بلوچی کو کئی بلوچ خود ایک پسماندہ اور دیہاتی زبان کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اِن کے خیال میں آج کے پاکستان میں بلوچی میں تعلیم سماجی اور معاشی حیثیت کی بہتری میں مدد نہیں دے سکتی۔ اسی طرح لوگ اِس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ بلوچ اور بروہی کو مختلف زبانوں میں پڑھایا جائے گا۔ اگرچہ سیاسی اتحاد کی وجہ سے ریاست قلات میں اِن کی شناخت بالکل ایک ہے۔ بروہی اکثریت سے دو زبانیں' براہوئی اور بلوچی بولتے ہیں

(Farrell 2000--24-25)

گو کہ ثقافتی ماحول برطانوی ہند اور بعد میں پاکستان میں بلوچی ثقافتی ادبی تحریک کے لیئے مکمل طور پر منفی نہ تھا لیکن گولڈ سمتھ لائن کی دوسری جانب حالات بالکل مختلف تھے۔ پہلوی شاہوں کی لِسانی اور ثقافتی پالیسی مکمل طور پر اکثریتی تھی۔ علاقائی رسم ورواج' روایات اور ثقافتوں کو مضبوط کرنے کی تمام کوششیں قوم دشمنی اور ایرانی سالمیت کے لئے خطرہ سمجھی جاتی تھیں۔ خاص طور پر وہ زبانیں جو ایرانی سرحدوں کے اندر بولی جاتی تھیں اور جو فارسی سے قربت رکھتی تھیں (ایرانی زبانیں)۔ انہیں فارسی کے مقامی لہجے کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ایسی صورتحال میں حکومت کی جانب سے مادری

زبان میں تعلیم، حتیٰ کہ ثقافتی سرگرمیاں یا اقلیتی زبانوں میں جرائد کی اشاعت کے لئے سہولیات کیسے ممکن ہوسکتی تھیں۔ موجب اور حسن پور اِس لسانی اور ثقافتی قبضہ گیریت کو نسل پرستی اور قومی تنگ نظری کی جھوٹی داستانیں اور پروپیگنڈہ کہہ کر اس منفی سوچ کو سرکاری سرپرستی میں ریاستی میڈیا، تعلیمی اداروں (جو تمام ریاستی ملکیت ہیں) اور اخبارات کے ذریعے پھیلانا قرار دیتے ہیں اور اِن کے مطابق اِسکا مقصد ایران میں قومی، لسانی اور ثقافتی تنوع (diversity) سے انکار کرنا ہے۔ (Mojab and Hassanpour 1995:231-232) اسلامک ریپبلکن آف ایران کے آئین کے چیپٹر ا، آرٹیکل 15 کے مطابق سرکاری زبان فارسی کے علاوہ علاقائی اور قومی زبانوں کا پریس اور ذرائع ابلاغ میں استعمال اور اِن کے لٹریچر کا سکولوں میں پڑھانے کی اجازت ہے (Algar:1980:34) اِس کے معنی ہیں قانونی طور پر بلوچی میں کُتب اور اخبارات کے اشاعت کی اجازت ہے۔ لیکن موجودہ وقت مشکل سے ایران میں کوئی ایسا کام ہورہا ہے۔ جہاں تک سکولوں میں بلوچی لٹریچر پڑھانے کی بات ہے، تحریری بلوچی لٹریچر تقریباً ناپید ہونے کی وجہ سے ایسے مضمون کے لئے کسی سہولت کی کوشش نہیں ہورہی ہے۔

ایران میں پہلی بار بلوچی میں اشاعت اسلامی انقلاب کے جلد بعد ممکن ہوئیں (1979-1980) کئی میگزین چند مہینوں کے لئے نظر آئے لیکن اِن اشاعت کو جلد بند ہونے پر مجبور کیا گیا۔ 1990ء کی دہائی کی آخر میں بلوچی میں اشاعت پھر بحال

زبان میں تعلیم، حتیٰ کہ ثقافتی سرگرمیاں یا اقلیتی زبانوں میں جرائد کی اشاعت کے لئے سہولیات کیسے ممکن ہوسکتی تھیں۔ موجب اور حسن پور اِس لسانی اور ثقافتی قبضہ گیریت کو نسل پرستی اور قومی تنگ نظری کی جھوٹی داستانیں اور پروپیگنڈہ کہہ کر اس منفی سوچ کو سرکاری سرپرستی میں ریاستی میڈیا، تعلیمی اداروں (جو تمام ریاستی ملکیت ہیں) اور اخبارات کے ذریعے پھیلانا قرار دیتے ہیں اور اِن کے مطابق اِسکا مقصد ایران میں قومی، لسانی اور ثقافتی تنوع (diversity) سے انکار کرنا ہے۔ (Mojab and Hassanpour 1995:231-232) اسلامک ریپبلکن آف ایران کے آئین کے چیپٹر ا، آرٹیکل 15 کے مطابق سرکاری زبان فارسی کے علاوہ علاقائی اور قومی زبانوں کا پریس اور ذرائع ابلاغ میں استعمال اور اِن کے لٹریچر کا سکولوں میں پڑھانے کی اجازت ہے (Algar:1980:34) اِس کے معنی ہیں قانونی طور پر بلوچی میں کُتب اور اخبارات کے اشاعت کی اجازت ہے۔ لیکن موجودہ وقت مشکل سے ایران میں کوئی ایسا کام ہورہا ہے۔ جہاں تک سکولوں میں بلوچی لٹریچر پڑھانے کی بات ہے، تحریری بلوچی لٹریچر تقریباً ناپید ہونے کی وجہ سے ایسے مضمون کے لئے کسی سہولت کی کوشش نہیں ہورہی ہے۔

ایران میں پہلی بار بلوچی میں اشاعت اسلامی انقلاب کے جلد بعد ممکن ہوئیں (1979-1980) کئی میگزین چند مہینوں کے لئے نظر آئے لیکن اِن اشاعت کو جلد بند ہونے پر مجبور کیا گیا۔ 1990ء کی دہائی کی آخر میں بلوچی میں اشاعت پھر بحال

ہوئیں۔ موجودہ وقت دو زبانوں یعنی بلوچی اور فارسی میں دو میگزین ایک ایران شہر اور دوسری زاہدان سے شائع ہو رہی ہیں۔ جہاں تک ریڈیو پروگرامز کا تعلق ہے حالات مختلف ہیں۔ ریڈیو زاہدان سے روزانہ بلوچی پروگرامز نشر ہو رہی ہیں۔ حقیقت میں یہ نشریات 1960ء کی دہائی سے یعنی پہلوی بادشاہت کے وقت سے جاری ہیں۔ ان نشریات کے مواد کو عام طور پر بلوچ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اِسے بلوچی زبان کی حقیقی خدمت کی بجائے سرکاری پروپیگنڈہ خیال کرتے ہیں۔ ایران میں ٹی وی پر بلوچی نشریات کے لئے کوئی سہولت پیدا نہیں کی جا رہی۔

ایران میں ریاست تعلیم' انتظامیہ' ابلاغِ عامہ اور اشاعت وغیرہ کے لسانی میدانوں کو بھی اپنی گرفت میں لیئے ہوئے ہے۔ اِس لئے زبان کے اِن میدانوں (domains) میں مکمل یا تقریباً فارسی استعمال ہوتی ہے۔ ریاست کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ بلوچی زبان کی ترقی کی خاطر متحرک اقدامات اُٹھائے اور اِسے اِتنا طاقتور بنائے کہ میڈیا' تعلیم اور انتظامی سطح پر اُس کا استعمال ہو۔ اِس کی وجہ اِن کی یہ شدید خوف ہے کہ ثقافتی خودمختاری کی تحریک جلد سیاسی تحریک میں بدلے گی اور آزادی کے مطالبے شروع ہونگے۔

موجودہ حکومت کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِس نے پہلوی بادشاہت کے مقابلے میں کثیر الثقافتی کی زیادہ اجازت دے رکھی ہے۔ ٹی وی پروگراموں میں علاقائی رنگ جیسے' رقص' لباس اور رسم و رواج عام نشر ہوتی ہیں۔ چابہار جہاں بہت سے بلوچ

ثقافتی میدان میں متحرک ہیں۔ انہیں ''شام شعروشاعری'' کی اجازت دی گئی۔ جس میں وہ بلوچ روایات اور جدید شاعری پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فارسی اور بلوچی میں دو زبانی میگزینز بھی ایک مثبت عمل ہے۔ دوسری اقلیتی زبانوں آزربائیجانی اور کردش میں کافی تعداد میں کتب اور اخبارات کی اشاعت ہورہی ہیں۔ ایران میں پہلی بار تبریز سے آزربائیجانی زبان اور ثقافت اور سنداج سے کردش زبان اور ثقافت میں بی اے (B.A) پروگرامز کی ابتداء تعلیمی سال 2004-05ء سے ہوئی۔ رشت یونیورسٹی میں گیلان سٹڈیز کا بھی ایک شعبہ قائم ہے۔

پاکستان میں تعلیم، انتظامیہ اور میڈیا میں بلوچی کا استعمال بہت محدود ہے۔ پھر بھی اتنا محدود نہیں جتنا کہ اس وقت ایران میں ہے۔ بلوچی عام طور گھروں میں یا اپنی برادری (عزیز واقارب، ہمسایوں، دوستوں وغیرہ) کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اور کبھی کبھار کام کے دوران بھی بلوچی بولی جاتی ہے۔ جہاں تک مذہب کی بات ہے عربی پڑھنے اور عبادت کی زبان ہے۔ جبکہ وعظ ونصیحت پاکستان اور ایران دونوں ملکوں میں بلوچی بولنے والی برادری کو سمجھانے کی خاطر بلوچی میں کی جاتی ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر بلوچی کو روائیتی حلقوں (domains) کی زبان سمجھا جاتا ہے جو موجودہ سماج میں کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی۔

انتظامیہ تعلیم جیسے عزت والے حلقے (domains) جہاں سماج میں آگے بڑھنے کے مواقع موجود ہیں، بلوچی زبان کے حلقے نہیں۔ یہاں ریاستی زُبان/زبانوں

کا غلبہ ہے۔ اِس لئے بہت سے والدین جو اپنے بچوں کو سماج میں آگے بڑھتا دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ بلوچی کی بجائے اِن زبانوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں تعلیم اور سوسائٹی میں آگے بڑھنے کی قربانی دیکر ہی بلوچی کو بچانا ممکن ہوسکتا ہے۔ فارل (2000:20) کا خیال ہے کہ موجودہ وقت میں جزوی طور پر تعلیم کا فقدان ہی بلوچی کو طاقت بخش رہی ہے لیکن تعلیم سے دُوری ایک ایسی صورتحال ہے جسکا جاری رہنا نقصان دہ اور ناممکن ہے۔ ریاستی حکمران اشرافیہ کی خواہش ہوگی کہ بلوچ ناخواندہ ہی رہیں تاکہ وہ جدید سیاسی نظریوں کو نہ اپنا سکیں' لیکن یہ یقینی طور خود بلوچ اکثریت کی خواہش نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ بلوچستان میں شرح خواندگی اب بھی کم ہے لیکن یہ بتدریج بڑھ رہی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے اور میں نے کئی ایسے لوگوں سے انٹرویو بھی کیئے جو ایرانی بلوچستان میں رہتے ہیں یا جنہوں نے حال ہی میں اُس علاقے کا سفر کیا' یہ بالکل صحیح ہے کہ آجکل وہاں اکثر بچے' بچیاں کم از کم پرائمری تک تعلیم حاصل کرتے ہیں' روایتی طرزِ زندگی زیادہ سے زیادہ جدید طرزِ زندگی کو راستہ دے رہی ہے جو تعلیم کو آسان اور پُرکشش بناتی ہے۔ اِس طرح تقریباً تمام نوجوان نسل زیادہ سے زیادہ 6 سال کی عمر سے جب وہ سکول میں داخلہ لیتے ہیں فارسی سے متعارف ہوجاتے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم پر اسلامی انقلاب کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ سکول کھلنے اور لازمی نقاب کی وجہ سے سماجی ثقافتی رکاوٹیں کسی حد تک کمزور ہوگئیں۔ دوسری طرف اطلاعات ہیں کہ چھوٹے دیہاتوں میں جہاں کم بچے ہوتے ہیں' بچے اور بچیوں کو ایک کلاس

میں پرائمری تک پڑھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے پرائمری کے بعد زیادہ بچیاں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتیں۔

1996ء (آبان 1375 ایرانین انو ہجرا شمسی کیلنڈر) کی مردم شماری کے مطابق سیستان بلوچستان صوبے میں 6 سال سے زیادہ شرح خواندگی 57 فیصد تھی۔ جنس کے لحاظ سے 49 فیصد خواتین اور 65 فیصد مرد تھے (ایرانی سٹیٹس ٹیکل سالہ کتاب (1377:2000:603) خواندگی کی تعریف یہ کی گئی ''کہ وہ تمام لوگ جو فارسی یا کسی اور زبان میں سادہ تحریر لکھ اور پڑھ سکتے ہوں' اور وہ بھی جنہوں نے ایک سال پرائمری سکول یا اس کے مساوی پڑھا ہو''۔ انہیں خواندہ شمار کیا گیا۔ (ایران سٹیٹس ٹیکل سالانہ کتاب (1377:2000:595) سیستان بلوچستان کے اعداد و شمار کا موازنہ ملک کے اوسط خواندگی کے اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے جو اِسی سال 80 فیصد تھی اور سیستان بلوچستان کے بعد سب سے کم خواندہ صوبہ کردستان کے ساتھ جہاں 68 فیصد خواندگی تھی' (ایران سٹیٹس ٹیکل سالانہ کتاب (1377:2000:603)- دس سال پہلے 1986ء (مہر 1365 ایرانی ہجری شمسی کیلنڈر) میں سیستان اور بلوچستان میں شرح خواندگی 36 فیصد تھی اور پورے ملک میں شرح خوانگی 61 فیصد تھی (ایران سٹیٹس ٹیکل سالانہ کتاب 1370:1993:123) دوسری وجہ جس نے ایرانی بلوچستان میں فارسی کے اثر کو مضبوط کیا وہ صوبے کو بجلی کی سہولت مہیا ہونا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے سے شروع ہو چکی تھی لیکن اسلامی انقلاب کے بعد اِس پر کام تیز ہوا اور اب تقریباً ہر علاقہ

تک اِس کی ترسیل مکمل ہوگئی۔ صوبے میں بجلی کے ساتھ ٹیلی ویژن آیا۔ بہت سے بلوچ مرد حضرات خاص طور بلوچستان کے جنوبی حصوں سے اپنا کچھ وقت خلیجی ریاستوں میں مہمان مزدور کی حیثیت سے گزارتے ہیں جہاں سے وہ بلوچستان میں اپنے خاندان کے لئے بجلی کا سامان جیسے ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ خریدتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سب سے پہلے 1960ء کی دہائی میں صوبائی ہیڈکوارٹرز زاہدان میں متعارف ہوئی۔ لیکن اب ٹی وی ایرانی بلوچستان کے اکثر دُور دراز علاقوں تک پہنچ چکی ہے۔ بلوچستان میں فارسی کو متعارف کرانے میں ٹی وی نے سب سے بڑی پیش رفت کی ہے، (کیونکہ ٹی وی سمعی بصری دو طرح اثر کرتی ہے)۔ بچپن سے یہاں تک کہ سکول جانے سے بھی پہلے فارسی پروگرامز دیکھ کر بلوچ بچے اِس زبان سے متعارف ہو جاتے ہیں اور اِس کا تہرانی تلفظ سیکھتے ہیں۔ جو بڑی نسل کے اکثر تعلیم یافتہ بلوچوں کے لئے ممکن نہیں، جو عام طور فارسی بلوچی تلفظ کے ساتھ بولتے ہیں۔ اِسکی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ سکول میں مقامی اساتذہ کے توسط سے فارسی سے متعارف ہوئے جو خود فارسی سیستانی یا بلوچی تلفظ سے بولتے تھے۔ میرے کئی ایرانی بلوچ دوست یاد کرتے ہیں کہ وہ سکول میں فارسی بولتے شرمندگی محسوس کرتے تھے، خاص کر فارسی بولنے والے کلاس فیلوز کے سامنے جو اِنکی تلفظ کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

ایرانی بلوچی کی ساخت پر فارسی کا اثر

"Structural influence from Persian on Iranian Balochi"

ایرانی بلوچستان میں بلوچی کے دو بڑے لہجے' مغربی (یارخشانی) جنوبی (یامکرانی) بولے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لہجے گولڈسمتھ لائن کے دوسری جانب بھی بولے جاتے ہیں۔ایرانی بلوچستان میں ایک علاقہ ساراوان بھی ہے جہاں ایک مخصوص لہجہ جو بڑی حد تک بلوچی کے دوسرے لہجوں سے زیادہ فارسی سے متاثر ہے' بولی جاتی ہے۔(see also Baranzehi:2003)۔آجکل یہ بالکل واضح ہے کہ قومی زبان فارسی' سماجی اور ثقافتی لحاظ سے حاوی زبان ہے اور بلوچی کم حیثیت والی ایک دیسی زبان ہے۔ بہرحال ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ ساراوان کی مثال اسکا مکمل ثبوت ہے۔ساراوان میں ایک یا دو صدی قبل مقامی سماج میں بلند حیثیت بلوچ قبائل افغان یا دوسرے فارسی بان نسل کے مہاجر کسانوں جو بلوچوں سے کافی بعد یہاں آئے تھے کے ساتھ ساتھ رہتے تھے(spooner: 1967:56) متصل زبانیں مختلف انداز میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں' متاثر کرنا زبان کی نسبت اسکی حیثیت پر زیادہ منحصر ہوتا ہے۔تقریباً برابر حیثیت والی دو یا زیادہ زبانیں ایک دوسرے کی ساخت اور الفاظ کو متاثر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بولی جاسکتی ہیں۔ایسی صورت میں وہ ایک دوسرے کو مٹا نہیں سکتیں۔ اسے ایڈسٹریٹ اثر (adstrate influence) کہتے ہیں۔ دوسری صورت وہ ہے جب ایک بالادست زبان جیسے فاتح گروہ یا سیاسی طور بالادست

اشرافیہ کی زبان' زیردست زبان جیسے اقلیتی گروہ کی زبان کو متاثر کرتی ہے۔ اس قسم کے اثر کو اکثر سپر سٹریٹ (superstrate) کہتے ہیں' کبھی کبھار یہ اصطلاح متصل زبانوں کا آخری نتیجہ نکلنے کے بعد بھی استعمال ہوتی ہے' جیسے فاتح اپنی زبان ترک کر کے مقامی زبان اپنائیں' جو بہر حال ان کی زبان سے کافی حد تک متاثر ہو چکی ہوتی ہے۔ ایسا نتیجہ اس وقت زیادہ متوقع ہے جب فاتح تھوڑی تعداد میں ہوں اور ایسے علاقہ میں سیاسی اقتدار پر قبضہ کریں جہاں ان سے مختلف زبان بولی جاتی ہو۔ جیسے نارمن کا برطانیہ کو تسخیر کرنا۔ بہر حال سپر سٹریٹ (superstrate) وسیع معنوں میں کم حیثیت والی زبان پر زیادہ حیثیت والی زبان جو عام طور جبری قبضہ یا سیاسی طور جذب ہونے سے مُسلط کی گئی' کے قابل شناخت اثرات کو بیان کرنے پر بھی استعمال ہوتی ہے (Trask 2000:330) اس تعریف کے مطابق ایران میں فارسی کی اقلیتی زبانوں پر بناوٹی (structural) اور لفظی (lexical) اثرات کو سپر سٹریٹ کا نام دے سکتے ہیں۔ اگر چہ یہ بالکل غیر متوقع ہے کہ آج کے ایران میں مقامی زبانیں فارسی کی جگہ لے لیں۔

عام طور پر سب سٹریٹ (substrate) کی اصطلاح ایسے زبان کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جو ایک علاقہ یا گروہ میں پہلے سے بولی جاتی ہو اور جس نے نئی آنے والی زبان پر واضح اثر ڈالا ہو (Trask 2000:329) جیسا کہ سپر سٹریٹ میں ہے۔ یہ اصطلاح عام طور سب سٹریٹ زبان اور نئی آنے والی زبان کی حیثیت میں فرق کی

طرف اشارہ کرتا ہے جہاں سب سٹریٹ زبان کم حیثیت والی زبان ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاح اسوقت بھی استعمال ہوتی ہے جب نئی زبان پرانی زبان کی جگہ لے۔ اور پرانی زبان نئی پر اپنی بناوٹی (structural) اور لفظی (lexical) خدوخال (traits) چھوڑ دے۔ اس کی مثال سلٹک (celtic) زبان کی انگریزی پر خدوخال ہیں۔

ساراوان کی مرکزی وادی کا لہجہ جسکا ذکر اُوپر کیا گیا' متصل لسانی پس منظر پر کام کے سلسلے میں خاص طور پر دلچسپ ہے۔ ساراوان میں مالداری کے علاوہ معیشت بنیادی طور پر بندوبستی زراعت (settled agriculture) پر منحصر ہے جسکی ایرانی بلوچستان کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں ایک لمبی تاریخ ہے اور یہی تعلیم پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ تعلیم فارسی میں ہے اِس لئے یہ فارسی کے اثر کو کافی مضبوط کرتی ہے۔ فارسی میں تعلیم اور صدیوں پہلے فارسی بولنے والوں کی ساراوان آمد دونوں نے ملکر اس لہجہ کو متصل زبانوں پر کام کے لئے ایک دلچسپ چیز بنادیا۔

یہ دکھائی دیتی ہے کہ ماضی میں بلوچی ساراوان میں بلند حیثیت کی زبان تھی۔ اِس لئے مہاجروں نے فارسی ترک کرکے بلوچی اپنالی بہرحال سب سٹریٹ مظہر (substrate phenomena) کا نمایاں اثر فارسی سے ساراوانی بلوچی پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ خدوخال ایرانی یا پاکستانی بلوچستان میں بلوچی کے کسی اور لہجہ میں نہیں ملتے۔ ایسے مظہر کی مثال مضاف علیہ (genitive) کی جگہ اضافہ (izafa) لگا کر اِسے مضاف علیہ سے منصوب کرنا' کلی طور ایسی قسم فارسی سے بہت مشابہہ ہے۔

دوسری بناوٹی تبدیلی (structural reshaping) یہ ہے کہ تمام لاحقے (post-positions) حرف جار (prepositions) میں تبدیل ہو گئے۔

آج کی فارسی بلاشبہ بلند حیثیت والی زبان ہے۔ اُس کی سپر سٹریٹ اثرات ساراوانی اور اِسی طرح ایران میں دوسرے بلوچی لہجوں پر کافی ہیں۔ سپر سٹریٹ مظہر میں سے مارفالوجیکل (Morphological) بناوٹ کی بجائے نحوی بناوٹ (syntactic construction) (بلاواسطہ چیزوں کیلئے) کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ایڈجیکٹوز (adjectives) کو اِن کے اسم (noun) کے بعد اضافہ (izafa) کے ساتھ ملانے کے لئے رکھنا۔ اور فعل کی ٹنس اسپیکٹ مُوڈ (Tense aspect mood) (TAM) فارم کی قسم فارسی بناوٹ بنی ہے۔ (جیسے پروگریسو حال اور ماضی) اِس کے علاوہ ہر لہجہ میں بہت زیادہ فارسی الفاظ کا استعمال بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

کیا بلوچی زبان کا ایرانی ریاست میں کوئی مستقبل ہے

(Is there a future for the Balochi Language within the State of Iran)

جب تک ایک زبان کو اِس کے بولنے والے روزمرہ زندگی کے ہر میدان (domains) میں استعمال میں لائیں گے یا کم از کم بولنے والوں کی اکثریت اپنی زبان کا استعمال اِسی طرح کرے گا' ایسی زبان کو خطرے میں گھرا نہیں کہہ سکتے۔ لیکن جونہی سماجی اقتصادی تبدیلیاں آتی ہیں۔ اِن سے ایک کمیونٹی کی رہن سہن' ثقافت اور کسی حد تک اس کی شناخت کی تمام بنیادیں ہل جاتی ہیں جب یہی کچھ ایک اقلیتی گروہ جیسے

بلوچ کے ساتھ پیش آئے تو گروہ یا اِس کے افراد مختلف نظریے اپنا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اِن میں جو نمایاں اور منفرد خصوصیات ہیں، جیسے اِن کی زبان' اُن سے دست بردار ہونے پر تیار ہو کر اکثریتی سماج میں قبولیت کی مکمل کوشش کریں' دوسری صورت میں وہ اپنی شناخت کے دفاع کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح کی خودمختاری کا مطالبہ کریں' جیسے وہ ملک کے اندر رہتے ہوئے علیحدہ گروہ کی حیثیت سے اپنی شناخت بچانے کی بھی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ ایسی صورت میں حقیقت پر مبنی متبادل ہوگی اگر ریاستی حکمران مخصوص لسانی' ثقافتی ترقی اور عقیدے کے مطابق عبادات کی آزادی کے مناسب مواقع دیں۔

ایرانی بلوچستان میں فارسیوں کے خلاف گہرے شکوک پائے جاتے ہیں۔ جنہیں تحقیر سے اکثر اوقات گجر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بلوچی رسم ورواج جیسے انکی سماجی تنظیم اور وقار کی قدریں (honour codes) فارسیوں سے کافی مختلف ہیں۔ بلوچستان پر تہران سے بالواسطہ حکمرانی کے خلاف 1928ء کے بعد کئی بغاوتیں ہوئیں۔ (see e.g. Hosseinbor 2000: 141-164)۔ 1979ء کے بعد مختلف مذہبی مسالک نے بھی زور پکڑا۔ بلوچوں میں شدت سے یہ احساس پایا جاتا ہے کہ انکے سنی مسلک کی وجہ سے اسلامی ریپبلک میں جو شیعہ مسلک پر قائم ہے، انہیں آگے بڑھنے کے لئے مناسب مواقع نہیں دیئے جاتے۔

ایرانی بلوچوں کے پاکستان' افغانستان اور خلیجی ریاستوں میں رہنے والے بلوچوں کے ساتھ بھی مضبوط رشتے ہیں' جیسے 1928ء کے واقعہ کے بعد بڑی تعداد میں

بلوچوں کی کراچی ہجرت' افغانستان کے بلوچوں کے ساتھ قبائلی تعلقات' اور خلیجی ریاستوں میں روزگار کی تلاش میں مہمان مزدور کی حیثیت سے جانا۔ اکثریتی سوسائٹی میں ضم ہونے کے انتخاب کا مطلب ہے اِن رشتوں سے دست برداری۔ اِس لئے یہ غیر متوقع ہے کہ بلوچ مکمل طور اکثریتی سوسائٹی کو قبول کریں۔ اگر موجودہ سیاسی فریم ورک میں ثقافتی ولسانی ترقی کے لئے مناسب اقدامات نہ کیئے گئے' پھر یقینی طور سیاسی خودمختاری کیلئے مزید مطالبات سامنے آنے کی توقع ہے۔

یقیناً بہت سے بلوچ دانشور ایران میں بلوچی زبان کی مستقبل کے بارے جائز طور فکرمند ہیں۔ بلوچستان میں تعلیم کی ابتداء اور جدید سماجی اقتصادی ڈھانچہ کے مروج ہونے سے روائتی سماج کی بنیادیں آہستگی سے اور یقینی طور اُکھڑتی جارہی ہیں۔ بہرحال اِس حقیقت سے بھی آگاہی ہورہی ہے کہ اگر بلوچی کو ایرانی بلوچستان میں مضبوط زبان رہنا ہے تو خود بلوچ پر لازم ہے کہ اپنی زبان کے بارے مثبت رویہ اپنائے اور نئے میدانوں میں اِسکی ترقی کے لئے کام کرے' مثلاً لکھائی اور آخرکار بلوچی میں تعلیم کو ممکن بنانا۔ کچھ اقدامات پہلے سے اُٹھائے گئے جیسے دوزبانی (بلوچی فارسی) رسالوں کی اشاعت اور زیادہ سے زیادہ ادبی ثقافتی مجالس کے انعقاد کے لئے انتظامات وغیرہ۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ایرانی بلوچستان میں یونیورسٹی سطح پر بلوچی مضمون کے لئے کوششیں ہورہی ہیں یہ وہ اقدامات ہیں جو پاکستانی بلوچستان میں کئی سال پہلے اُٹھائے گئے۔

یہ ریاست ہی ہے جو لسانی اور ثقافتی پالیسیاں مرتب کرتی ہے' انتظامی اور

تعلیمی نظام کو کنٹرول کرتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ لوگوں کے مطالبات اپنے حکمران اشرافیہ کے فیصلوں پر کافی اثر انداز ہوتے ہیں۔ موجودہ مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بیسویں صدی کی ابتداء سے ایران کی نسبت برطانوی ہند میں بلوچی زبان کے لئے زیادہ موافق حالات نے ایک نئی تعلیم یافتہ بلوچ نسل کے لئے اپنی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کے لئے راستہ ہموار کیا یہ بتانا بہرصورت ضروری ہے کہ پاکستان میں بھی، بلوچی ثقافتی تحریک کو گھمبیر مسائل درپیش ہیں، جن میں پڑھنے والوں کی کم تعداد، معاشی مشکلات، اور سرکاری شکوک وشبہات شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ پاکستانی بلوچستان میں پرائمری تک بلوچی زبان میں تعلیم کی ناکام شروعات کی شدید منفی اثرات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، سیاسی طاقت ایک تبدیل ہونے والی چیز ہے۔ ایک وقت بلوچ قبائل ایرانی ساراوان میں بڑی طاقت تھے۔ انہوں نے دوسری نسلی گروہوں جیسے اُفغان اور سیستانیوں کو جذب کیا۔ جبکہ آج شیعہ مسلم ایران میں حکمران ہیں، پیشگوئی کرنا مشکل ہے کہ مستقبل میں ایران اور پاکستان کا سیاسی منظرنامہ کیا ہوگا۔ کیا موجودہ حکمران اشرافیہ اور بلوچ کے مابین سیاسی طاقت میں نئی تبدیلی آسکتی ہے؟ اِس بارے میں ہم کچھ نہیں کرسکتے، صرف قیاس آرائی ہی ہوسکتی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم، بلوچی زبان کی سلامتی اور اسے زندہ رکھنا

(یہ مضمون جناب فارل نے اپسالا یونیورسٹی (سویڈن) میں بلوچی پر ایک سمپوزیم جو متحرمہ کارینا جاھانی نے منعقد کرائی ۱۷ اگست ۱۹۹۷ء میں پڑھی تھی۔)

تعارف: اس تحریر کا مقصد بلوچی زبان میں تعلیم سے منسلک حل طلب مسائل اور ان مشکلات و فوائد کا جائزہ لینا ہے جو شاید ابھر کر سامنے آئیں۔ بلوچی کا کچھ دیگر زبانوں پر تحقیق (Studies) سے بھی موازنہ کر کے دیکھیں گے، وہ اکثر بلوچی سے چھوٹی ہیں اور بڑے خطرات سے دوچار ہیں ان تحقیق سے جو بھی اصول سامنے آئے بہت سے بلوچی پر پورے اترے ہیں۔ بہتر اور موزوں وقت یہی ہے کہ بلوچی زبان کے مستقبل کے سوال کو اٹھایا جائے نہ کہ اتنا انتظار کریں کہ بلوچی کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہو اس لیے اس مضمون کے موضوع کو پھیلا کر اور میدان کو وسیع کر کے بلوچی کے تحفظ اور بہتری کے لئے بات کر رہے ہیں۔

آج دنیا میں اندازاً چھ ہزار پانچ سو (۶۵۰۰) زبانوں میں سے آنے والے پچاس سالوں میں ان کی اکثریت ختم ہی ہوگی۔ دنیا کی تاریخ میں زبانیں آئیں اور گئیں لیکن آج کے دور میں ایسے اسباب موجود ہیں جو پہلے کبھی نہیں تھے جنہوں نے دنیا میں

بہت سی زبانوں کو ایسے خطرات سے دوچار کیا کہ وہ پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ پہلی سبب یہ ہے کہ دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور نقل وحرکت کی وجہ سے بہت کم لوگ ایسے ہونگے جن کا دوسرے زبان بولنے والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ ہو اس طرح ایک بڑی آبادی مسلسل غیر زبان بولنے والوں سے ملتا جلتا ہے۔

دوسری سبب الیکٹرانک میڈیا کی ترقی، استعمال اور مواصلات کی تیزی ہے ابھی ایسے ظاہر ہونا ہے کہ بلوچی جسے زیادہ تر نیم خانہ بدوش مالدار، دیہاتی کسان اور ماہیگیر بولتے ہیں جو دور دراز وسیع بلوچستان میں رہتے ہیں، شہری تجارتی اور تفریحی ترقی سے متاثر نہیں ہوگی۔ لیکن دلچسپ بات ہے کہ لیاری کے بلوچوں میں خاندانی تفریح صرف ایک نسل میں قصہ کہانیاں سننے کی بجائے پہلے ریڈیو پھر ٹی وی، ویڈیو اور اس کے بعد سیٹلائیٹ نے لے لی۔ یہ ایک ایسی کمیونٹی کے ساتھ پیش آیا جس کے پاس زیادہ اقتصای وسائل نہیں تھے۔ بلوچستان کے آبادی والے علاقوں جیسے گودار، پنجگور، تربت، وغیرہ میں ترقی اور بجلی پہنچنے سے ظاہر ہوتا ہے یہ عمل تمام بلوچی بولنے والے علاقوں میں تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

آنے والے وقت کی پیش گوئی مشکل ہے۔ ایک منظر (Scenario) یہ ہو سکتا ہے کہ ذرائع ابلاغ (Mass Media) کی ہر طرف پھیلنے اور ملک میں قومی زبان (اردو) میں تعلیم بلوچی کو ایسے نیچے گرادیگی کہ بلوچی صرف دیہاتوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں بولی جائیگی شہروں اور گاوں میں گھر کے صرف بوڑھے لوگ بلوچی میں بات کریں گے۔

زبان کے حلقے(Language Domains)

ایک طریقہ جاننے کا کہ زبان کتنا سلامت اور طاقتور ہے یہ ہے کہ سوسائٹی میں یہ زبان کہاں کہاں استعمال ہوتی ہیں اگر ایک زبان گھر، کام کاج، تعلیم، تجارت ایڈمنسٹریشن، مذہب، تفریحی جگہوں اور صحافت میں استعمال ہوتی ہے پھر اس زبان کی مانگ سوسائٹی کے کافی حلقوں میں ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ ایک زبان کی طرح وہ اپنی ترقی کو قائم رکھے گی دوسری طرف اگر ہم دیکھیں مثلاً گھر میں صرف بوڑھی عورتیں ایک زبان میں بات کرتی ہیں اور تمام دوسرے مقاصد کے لئے دوسری زبان استعمال ہوتی ہو۔ تو پھر ہم فیصلہ دے سکتے ہیں یہ زبان کمزور ہے اور ہوسکتا ہے چند پشتوں بعد وہ ختم ہوجائے۔

بلوچی زبان جو اتنے وسیع سرزمین پر بولی جاتی ہے اس کے استعمال کے مختلف پیمانے (Laveles) ہیں۔ اندرون بلوچستان بلوچی کم وبیش ہر میدان میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن شہروں میں دوسری زبان (Second Langage) جیسے فارسی اُردو بہت سے کاموں، تعلیم اور میڈیا میں استعمال ہوتی ہے وہاں بلوچی زیادہ تر گھروں اور مقامی کمیونٹی کی زبان کی طرح زندہ ہے اس وقت کسی حد تک بلوچی زبان کو طاقت عطا کرنے کی وجہ تعلیم کا نہ ہونا ہے کیونکہ اکثر بلوچ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے تجارتی دفتری اور ادبی کاموں میں بہت کم حصہ لیتے ہیں اس طرح جہاں دوسری زبانیں استعمال ہوتی ہیں وہاں بلوچوں کا حلقہ بہت محدود ہے۔ یہ عورتوں کے لئے زیادہ صحیح ہے، اگرچہ تفریح

کے لیے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال ان کے بھی الیکے پن کو کم کر رہی ہے لیکن بلوچوں کی علیحدگی و ناخواندگی نہ تو بلوچوں کے فائدے میں ہے اور نہ لمبی مدت تک بلوچی کی سلامتی کے حق میں ہے۔ ناخوندا گی مدام بھی نہیں ہوسکتی۔ چند پشتوں بعد جب لوگوں کا بڑے تجارتی اور قومی زبانوں سے رابطہ ہوگا۔ تو خاندان دوزبانی (Bilingualism) کی طرف مائل ہونگے اور پھر یہ زیادہ ہوتا جائیگا آخر کار صرف منڈی اور قومی زبان استعمال ہوگی یہ عمل (Process) کراچی میں پہلے سے شروع ہے اور جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اسی طرح ایران میں بھی۔ بہت سے کمیونٹیز میں مذہب کے میدان میں بلوچی میں وعظ نصیحت ہوتی ہے لیکن عبادت اور نماز کے متبرک آیات عربی میں ہیں نمازی اور ذگری دونوں مسلمانوں میں یہی ہوتا ہے اس طرح بلوچی وہ پشت پناہی سے محروم ہے جو بہت سے زبانوں کو مذہب کے متبرک آیات کی وجہ سے حاصل ہے اس کے باوجود یہ بہت مثبت عمل ہے کہ دین کے تمام موضوع (Topic) پر بلوچی میں پوری طرح بحث ہوتی ہیں یہ اچھی بات ہے کہ بلوچی نے عربی فارسی اور اردو اصطلاحات (Terminologies) کے آزاد استعمال سے یہ سب کچھ حاصل کی ادبی میدان میں یہ مولانا خیر محمد ندوی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان کی وجہ سے ایک مستحکم (Well Established) سابقہ مثال اور فورم موجود ہے جہاں مذہبی مسائل پر بلوچی میں بحث مباحثہ ہوتی ہے۔

کاترین وولارڈ (Kathryn Woolard)(۱۹۸۹ء) نے اقلیتی

زبانوں کے مطالعہ سے مشاہدہ کیا کہ دوزبان (Bilangual) مقرر نے جب موضوع / میدان میں بات کرنے کے لئے زبان چنا، پھر وہاں چھوٹی زبان ہے کہ کمزوری اور زیر دستی کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن جب کسی خاص موقع پر وہاں حصہ لینے والوں کی مطابقط سے ایک زبان چنا جائے پھر چھوٹی زبان دوسری زبان میں تبدیل ہونے کی کمزوری نہیں دکھاتی۔

اس طرح مثلا اگر ایک بلوچ دوسرے بلوچ کو اردو میں خط لکھنا اپنی مجبوری محسوس کرے تو یہ بلوچی کی کمزوری اور محدود ہونے کو ظاہر کرتا ہے لیکن اگر ایک بلوچ ایک غیر بلوچ کو اردو میں اور بلوچ کو بلوچی میں خط لکھے تو اس طرح کی دوزبانی کا استعمال بلوچی کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتا۔ رابطہ اور دوسری زبان کا استعمال بذات خود چھوٹی زبان کے لئے خطرہ نہیں۔

جب تجارت، ٹیلیویژن، اخبارات، تعلیم، بلوچوں کو زیادہ سے زیادہ ایسے میدانوں میں جہاں وہ کام کریں گے لانے کی ایک بڑی وجہ بنیں گی جہاں بلوچی نہیں بلکہ دوسری زبانیں ہونگی۔ تو یہ بلوچ کمیونٹی کے لئے ایک چیلنج ہوگا۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ظاہر ہے بلوچی کا استعمال ان میدانوں میں جتنا ممکن ہوسکے زیادہ سے زیادہ کیا جائے اور واحد طاقتور آلہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مادری زبان میں تعلیم ہے۔ کیونکہ مادری زبان میں تعلیم بلوچی زبان کے استعمال کو مختلف اکیڈمک (Acadmic) میدانوں میں پھیلانے کا ایک وسیلہ ہوگا، اگر مادری زبان میں تعلیم

سکول کے تمام نصاب تک وسیع نہ بھی ہو سکے پھر بھی تعلیم کا اثر اور رسمی کاموں میں مادری زبان کا استعمال اس کی استعمال کے میدان کو بڑی حد تک وسیع کرے گا۔

مادری زبان میں تعلیم کو روایتی طور پر بڑی امید کے ساتھ دیکھا گیا کہ زبان کو بدلنے سے روکتا ہے۔ اگرچہ جوشوا فشمین (Joshva Fishman) نے تسبیح کی کہ اکیلے مادری زبان میں تعلیم زبان کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتی جب تک گھروں میں اس کا استعمال مثبت انداز میں دوبارہ بحال نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح مثلاً گیلک (Gaelic) زبان آئرلینڈ میں سکولوں میں پڑھایا اور بہت سے حکومتی کاموں میں استعمال کیا گیا، لیکن پھر بھی گھروں اور کمیونٹی میں وسیع طور پر استعمال نہیں ہوا۔ اس طرح فشمین نشاندہی کرتا ہے کہ صرف ماردی زبان میں تعلیم زبان کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے کافی نہیں۔ لیکن بلوچی گھر اور کمیونٹی میں بڑی حد تک بولی جاتی ہے بلوچی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا استعمال گھروں سے باہر زیادہ ہو اور خاص کر عام حالات میں اس کا استعمال زیادہ ہو۔ پس یہ امید کی جاتی ہے کہ مادری زبان میں پڑھانے اور تعلیم عام ہونے سے بلوچ خطوط، پوسٹ سائنز (Post Singns) نوٹسز (notices) اور بلیٹنز Bulletins بلوچی میں لکھیں گے اور بلوچی اخبار اور میگزین پڑھیں گے۔ اس طرح تجارتی اور حکومتی انتظام Government Administration بھی بلوچی میں کرنے لگیں گے۔

مادری زبان میں تعلیم (Mother Tongue Education)

کئی سال سے یہ تسلیم شدہ ہے کہ مادری زبان تعلیم کے لئے سب سے اچھی زبان ہے خاص طور ابتدائی سالوں میں یونسکو(UNESCO) کا مونوگراف تعلیم میں مقامی (قومی) زبانوں کا استعمال ۱۹۵۳ء کہتا ہے۔ تعلیمی میدان میں ہم تجویز کرتے ہیں مادری زبان میں تعلیم جس لیول تک ممکن ہو دی جائے اور خاص طور پر بچے پڑھائی کا آغاز سکولوں میں مادری زبان سے کریں۔ چھوٹے بچوں کے لئے پہلی دفعہ سکول جانا بہت مشکل تجربہ ہوسکتا ہے گھر کے آزاد ماحول سے دور یکدم سکول کے مخصوص اور ڈسپلن ماحول میں جانا اور ان سے منظم طریقے سے کام کرنے کی توقع رکھنا، پڑھ لکھ سیکھ جانا ریاضی اور دوسرے مضامین کی ٹرمینالوجیز Terminologies اور مثالوں وغیرہ کے تصور کو سمجھنا بذات خود بدل کرنے والی مہم (Task) ہے۔ اگر یہ تمام بیگانے زبان میں ہوں تو یہ بچے کے لئے پریشان کن (confusing) ہوگا۔ اور یہ حقیقت بھی شامل ہو کہ سکول کا کام ضرورت کے مطابق نہ کر پانے پر بچوں کی اکثر پٹائی بھی ہوتی ہو پھر یہ ایسا تجربہ ہوگا کہ بچے دل برداشتہ ہو کر سکول چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

پس یونسکو رپورٹ کہتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ صدمہ جو چھوٹے بچوں کو گھر سے باہر آنے اور سکول جانے سے پہنچتا ہے اتنا شدید ہوتا ہے کہ اسے کم کرنے کے لئے جو بھی ممکن ہو قدم اٹھانا چاہیئے خاص طور پر وہاں جہاں ابھی تک چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لئے جدید طریقے سکول میں رائج نہیں ہو سکے۔ اس کا اثر کراچی میں لیاری کے

بڑی بلوچ کمیونٹی پر یہ ہوا کہ پہلے سالوں میں سکول چھوڑنے کی تعداد (drop out rate) ۵۰ فیصد ہے۔ (یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام بچے سکول میں داخلہ نہیں لیتے) اور کئی بچے آنے والے سالوں میں سکول چھوڑ جاتے ہیں۔

لیاری کے سکولوں میں سیٹوں کی کمی کی وجہ سے نئے آنے والے بچوں سے اردو اور ریاضی کا داخلہ ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری سکولوں میں داخلہ لینے سے پہلے اکثر بچوں کو ایک یا دو سال پرائیویٹ سکولوں یا ٹیوشن سنٹرز میں پڑھنا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ سکول میں دوسرے بچوں کے مقابلہ میں ایک یا دو سال بعد داخلہ لیتے ہیں۔ جو ان کی بددلی کا سبب بنتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے دوسری چیز جو مثاتر ہوتی ہے وہ معیار تعلیم ہے مجھے یاد ہے گوادر کے نزدیک ایک دیہات میں سکول کے ایک بچے نے اردو کتاب سے مضمون صحیح اور روانی سے پڑھی لیکن جب اس سے پوچھا گیا کہ کس بارے میں ہے وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ مشکل پڑھنے والوں کے ساتھ کئی سال تک رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آٹھویں جماعت سے پہلے محنتی اور ہوشیار بچے بھی حقیقی معنوں میں اپنے سبق کا مطلب نہیں سمجھ پاتے۔ جہاں بلوچ بچوں کا مقابلہ اعلیٰ تعلیم اور روزگار کے میدان میں ان بچوں سے ہو جن کی مادری زبان تعلیمی اور تجارتی ہے ظاہر ہے وہ ہمیشہ پیچھے رہیں گے اور انہیں یہ نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے گذشتہ چند سالوں سے کراچی میں نسلی فسادات اور تشدد کی وجہ سے تعلیمی اداروں میں داخلہ اور، روزگار کوٹہ سسٹم کی بجائے میرٹ کی بنیاد پر دی جارہی ہے۔ بذات خود میرٹ

ایک اچھی چیز ہے لیکن بلوچ اور دوسری نسلی اقلیتوں کے بچے جن کی مادری زبان تعلیمی نہیں کا ان بچوں سے مقابلہ کرانا جنہوں نے مکمل تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کی حقیقت میں میرٹ کے اصول کی بنیاد پر نہیں بلکہ نسلی ولسانی بنیاد پر ہے۔ مادری زبان میں تعلیم کا نہ ہونا ایک وجہ ہے کہ بہت سے لوگ تعلیم کو محض رٹا لگا کر امتحان پاس کرنا اور بہتر روزگار کا ذریعہ سمجھتے ہیں، یہ سوچ معدوم ہے کہ بچے وہ مضامین جو انہوں نے پڑھے سمجھیں اور ان پر سوچیں۔ یہ سوچ بھی نہیں کہ علم زندگی کا ایک بہترین ہنر ہے جو تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی اس کی بہتری کے لئے تمام عمر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک دلچسپ پہلو بلوچی اکیڈمیز اور ادبی رسائل کی ترقی کا یہ ہے کہ بہت سے بلوچ بلوچی میں دلچسپی اپنے آپ لیتے ہیں، وہ بلوچی سیکھتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں اس کے باوجود کہ بلوچی عام تعلیمی پروگرام کا حصہ نہیں۔

بلوچی میں تعلیم کی ترقی اور بچوں کو پڑھانے کے لئے بہت سی غیر سرکاری کتب لکھی گئیں۔ بنیادی اور اے بی سی کی کتب میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) ۱۹۵۱ء میں مکتبہ سوغات نے مولوی خیر محمد ندوی کی بلوچی قائدہ شائع کی جو ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۵ء، میں دوبارہ شائع ہوئی۔ مکتبہ سوغات نے خیر محمد ندوی کی "بلوچی اولی کتاب" بھی ۱۹۸۷ء، ۱۹۸۵ء میں شائع کی جو ایک بنیادی اور پڑھنے والی کتاب لمبے حروف کے ساتھ ہے۔

(۱۱) ۱۹۶۰ء میں سید ہاشمی نے بڑے عمر کے پڑھنے والوں کے لئے بلوچی **بنگیجی**

کتاب شائع کی۔

(۳)۱۹۶۳ء میں بلوچی اکیڈمی کراچی نے اکبر بارکزئی کی، زھگ بلد، شائع کی اس کا پہلا حصہ ۱۹۸۷ء میں بلوچ اتحاد کویت نے دوبارہ شائع کی یہ بچوں کی بنیادی کتاب ہے جو حروف الجد اور لمبے حروف کے ملانے سے پہلے دو پھر تین اس طرح کے پڑھنے کے طریقہ کو استعمال میں لاتا ہے۔

(۴) مارچ ۱۹۷۲ء میں قیوم بلوچ نے بلوچی زھگ بلد شائع کی جو فوٹو اور نشانات کی بنیادی الف، ب کی کتاب ہے۔

(۵) مارچ ۱۹۷۲ء میں بلوچی پبلیکیشنز نے لعل بخش رند کی بلوچی بوان بلوچی ھیل بکن ، جو تبدیل شدہ رومن سکرپٹ میں الف، ب کی کتاب ہے شائع کی۔

(۶)۱۹۸۶ء میں شرب کتابجاہ نے غلام محی الدین معیار کی الف، ب کی کتاب سکین شائع کی۔

(۷)۱۹۸۷ء میں کوئٹہ میں شال ایسوسی ایشن پاکستان نے عبدالحکیم صادق اور تہمور خان کی نئی کتاب شائع کی یہ لعل بخش رند کی بلوچی بوان کی طرح ہے لیکن عربی سکرپیٹ اور رخشانی لہجہ میں الف، ب کی کتاب ہے۔

(۸) اپریل ۱۹۹۵ء میں کراچی سے آزاد جمالدینی اکیڈمی نے لال محمد کی گل رنگ اور یاسمین کی بنیادی کتاب، پیتاپ اور ان کی الف ب کی کتاب نئی کتاب دسمبر ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔

اس کے علاوہ بہت سے اکیڈمیز نے بچوں کی کتابیں اور نئے پڑھنے والوں کے لئے آسانی سے پڑھی جانے والی مواد شائع کیں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے بہت سی کتب بچوں کے لئے شائع کیں دوسروں کے علاوہ کلاکوٹ کوچنگ سنٹر آزاد جمالدینی اکیڈمی اور بلوچی لبزانکی دیوان بھی اس میدان میں سرگرم رہے۔

ان میں سے جیسا کہ مجھے معلوم ہے لال بخش رند کی کتب کچھ عرصہ تک رسمی تعلیمی پروگرام میں استعمال ہوئی تھیں۔اب آزاد جمالدینی اکیڈمی کی کتب ایک تعلیمی پروگرام میں استعمال ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ شال ایسوسی ایشن کی بنی کتاب بلوچستان کے کچھ سکولوں اور سویڈن میں استعمال ہوئی تھی۔

موجودہ وقت میں بلوچوں کے لئے ریاستی تعلیم ایران میں فارسی پاکستانی بلوچستان اور مرکزی کراچی میں اردو سندھ میں زیادہ تر سندھی اور خلیج میں عربی ہے ان زبانوں کے الفاظ اور ان کے علاقائی خدوخال مستعار لینے سے ایک علاقہ کی بلوچی دوسرے علاقہ کی بلوچی سے مختلف ہوتی جارہی ہے اس طرح بلوچی زبان کمزور ہورہی ہے۔ان زبانوں کے علاوہ جو تعلیم اور دفتری میدانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ براہوئی پشتو، وسرائیکی بھی شامل کئے جاسکتے ہیں اگرچہ یہ تعلیمی زبان نہیں لیکن بلوچی پر ان کے علاقائی اثرات ہیں۔

۱۹۹۱ء میں پاکستانی بلوچستان میں مادری زبان میں تعلیم کا ایک حکومتی پروگرام تیار کیا گیا۔ تعلیم براہوئی بلوچی پشتو اور اس کے ساتھ ساتھ اردو میں دی جانی تھی۔ان

زبانوں میں تعلیم پہلی کلاس سے شروع ہونی تھی اور سال بہ سال آگے بڑھتی اور اسی طرح سکول کے تمام کلاسوں میں یہ زبانیں پڑھائی جاتیں۔ بلوچی کے لئے کمیٹی بنائی گئی تاکہ وہ نصابی کتب کے لیئے مضامین، سٹائل، اور لہجہ کا فیصلہ کرے۔ کیونکہ سمجھا جارہا تھا کہ بہتر یہی ہے تمام بلوچ علاقوں میں ایک کورس اور ایک جیسی نصابی کتب ہوں۔ ایک کوشش کی گئی کہ مشرقی و مغربی بلوچی لہجے کے الفاظ اور رسم الخط (املا) ملائے جائیں۔ اس کے لئے پانچ نئے مشترکہ کرکٹر (نشان) دونوں لہجوں کے تلفظ کو ملانے کے لئے ایجاد کئے گئے اس بارے تفصیل سے سٹنڈرڈائزیشن (standardisation) میں بحث کریں گے۔

پاکستانی بلوچستان میں بلوچی میں تعلیمی پروگرام کی ناکافی کی ایک ممکنہ وجہ سیاسی ہے مخفی اور پیچیدہ سیاسی مسائل پر بات کرنے پر ملوث نہ ہونے کی خواہش رکھتے ہوئے بلوچستان میں حالات اس طرح تھے اور ہیں۔ کہ افغان مہاجرین کی بڑے ریلی سے صوبہ میں بنیادی اعداد وشمار (Demography) تبدیل ہونے کا خوف ہے۔ ان مہاجرین میں سے کافی پاکستان میں بس گئے ان کو پاکستانی شناختی کاغذات حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ان کی اکثریت نسلا پشتون ہے۔ اور صوبے میں پہلے سے کافی تعداد میں پشتونوں کے ساتھ ان کا کھل مل جان آسان ہے۔ مشترکہ بلوچ اور براہوئی آبادی پشتونوں سے زیادہ ہے۔ بلوچ اور براہوئی نسلا ایک لیکن لسانی طور پر مختلف ہیں اس لئے جب بلوچستان کے سکولوں میں اردو پڑھائی جائے تو ان کی نسلی

اتحاد پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ لیکن اگر جدا بلوچی اور براہوئی سکول کھولے جائیں پھر زبان کی بنیاد پر تقسیم زیادہ دکھائی دے گی۔ اگر بلوچ اور براہوئی کو ایک کی بجائے دو مانا جائے تب یہ ڈر تھا پشتون یہ مطالبہ نہ کریں کہ وہ صوبہ میں تمام دوسری قوموں سے زیادہ ہیں۔ سیاسی میدان میں چونکہ اعداد شمار سب سے طاقتور قوتوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے کچھ نے یہ محسوس کیا بہتر یہی ہے کہ اردو میں تعلیم جاری رکھی جائے تا کہ بلوچوں میں زبان کا فرق سامنے نہ آنے پائے۔

زبان سے محبت (Language Attitude)

شاید زبان کی سلامتی اور اسے زندہ رکھنے کے لئے سب سے اہم واحد قوت زبان بولنے والوں کا اپنی زبان سے محبت ہے۔ بلوچ لوگ اپنی زبان سے مثبت سوچ کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن کلی طور پر یہ ایک بے عمل اظہار نظر آتا ہے اکثر بلوچی بولنے والوں کو نہ تو بلوچی سے حقیقی دلچسپی ہے اور نہ اسکی ترقی کی تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں۔

کراچی کے کچھ بلوچ بھی گھر میں اور دوستوں کے ساتھ اردو کے زیادہ سے زیادہ استعمال کو سماجی اور اقتصادی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس طرح وہ بلوچی کے استعمال کو مخصوص حالات میں ہی مناسب سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک بلوچی ان پڑھ ہونے کی نشانی ہے کراچی کے بلوچ کمیونٹی میں سب سے اچھی خصوصیات میں سے ایک ٹیوشن سنٹرز اور فٹبال کلبوں کا کردار ہے۔ جہاں کالج کے سٹوڈنٹ اور گریجویٹ کمیونٹی کے بچوں کو اضافی تعلیم مفت یا معمولی اجرت پر پڑھاتے ہیں چونکہ سکولوں کی زبان اردو

ہے اس لئے ٹیوشن بھی اردو میں پڑھائی جاتی ہے۔ان کا مقصد بچوں کی تعلیمی قابلیت بڑھانا ہے۔انہیں زبان کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں بلوچی میں بچوں کو کچھ سمجھایا جاتا ہے،لیکن کورس کا مواد اردو میں ہے۔ کچھ ٹیوشن سنٹر بلوچی میں تعلیم کے خلاف ہیں۔اس کے وجوہ سماجی اور اقتصادی بھی ہیں جیسا کہ اوپر بیان کی گئی ہیں اور سیاسی بھی،وہ ادبی اور تعلیمی میدان میں بلوچی کے استعمال اور ترقی کو بلوچ قوم پرست تحریک سے منسلک دیکھتے ہیں۔کراچی بلوچوں کی اکثریت تاریخی طور پاکستان پیپلز پارٹی کی مضبوط حامی رہی ہے لیکن ۱۹۷۳ء میں یہ پی پی پی کی حکومت تھی جس نے بلوچستان میں بلوچ حکومت ختم کی اور اس کے نتیجہ میں بلوچ مزاحمت کو طاقت سے دبایا۔اس طرح تاریخی طور پر بلوچستان اور کراچی کے بلوچوں میں کسی حد تک سیاسی اختلاف موجود ہے۔بلوچی زبان کے مستقبل کے لئے جیسا کہ دکھائی دیتا ہے بہت ضروری ہے کہ ان علاقوں کے بلوچ کم ازکم سماجی اور لسانی مسائل پر اتحاد کریں۔

سماجی میدان میں بلوچی زبان کو نہ صرف موجود حالت سے زیادہ استعمال کے میدان میں ترقی دینی چاہیے (جس میں دفتری، تعلیمی اور سائنسی میدان شامل ہیں) بلکہ ان میدانوں میں بلوچی کا استعمال اس کے بولنے والوں کے لئے سماجی اور معاشی طور پر بھی زیادہ فائدہ مند ہے۔موجودہ حالات میں بلوچی کو تعلیمی، تجارتی اور انتظامی میدان میں غیر اہم کر دیا گیا ہے اور یہاں تک کہ بلوچی کو ایک رکاوٹ سمجھا جا رہا ہے۔دوسری طرف اردو کو ان تمام میدانوں میں لازمی اور فائدہ مند بنا دیا گیا۔

ویلز (Wales) میں جہاں ولش (Welsh) زبان جو بلوچی سے بہتر استعمال اور قدر (Status) کے لحاظ سے کمزور تر ہے، نے سلامتی اور حیثیت کے لحاظ سے اس وقت سے کافی ترقی کی جب سے بہت سے دفتری اور تعلیمی میدانوں میں اس کے استعمال کو لازمی قرار دیا گیا۔ اس سے ویلز میں زبان کے ساتھ محبت اور توجہ پر کافی اثر پڑا اب وہاں ولش زبان کی حیثیت کو سماجی اور اقتصادی فوائد کے لئے مانا جا رہا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ اگر بلوچی کا ان میدانوں میں استعمال لازمی قرار دیا جائے تو اردو، فارسی، سندھی، عربی، اور انگریزی سیکھنا ضروری نہیں رہے گا۔ ان تمام زبانوں کا بلوچی بولنے والوں کو اب بھی ضرورت ہے۔ لیکن ان کے ساتھ بلوچی کا عام استعمال ان میدانوں میں ایک مستحکم دوزبانی (Bilangualism) ماحول پیدا کر سکتا ہے۔

زبان کو معیاری بنانا: (Standardisation)

بلوچی زبان کی معیاری (Standardised) رسم الخط اور لسانی مسائل پر ڈاکٹر کارینا جاہانی نے اپنے کتاب:

"Standardisation and ortherograaphy in Balochi language"

میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس لیئے میں یہاں چند سماجی لسانی پہلوں پر بحث کرونگا جن کا تعلق مادری زبان میں تعلیم سے ہے . مادری زبان میں تعلیم اور معیار (Standard) ایک دوسرے سے قریبی منسلک دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مشکل یا ناممکن ہوگا کہ بغیر کسی معیار کے بلوچی میں تعلیم دی جائے۔ ایک دفعہ مادری زبان میں تعلیم کی

بنیاد رکھ دی گئی چاہئے وہ زبان کی جو بھی قسم ہو جلد مشہور ہو کر پھیل جاتا ہے اس وقت بلوچی کو معیاری بنانے کا بغیر تعلیم کے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ ادبی اکیڈمیز ایک دوسرے کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر کہیں کسی حد تک اتفاق ہے بھی تو اس کی آواز تمام بلوچی بولنے والوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ تازہ اشاعت کے کاری بہت کم ہیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے زبان کو معیاری بنانے میں اس پر کوئی زیادہ اثر نہیں ڈالا۔ دوسری طرف حکومت بلوچستان کی پہلی جماعت کے لئے کتابوں کی اشاعت (۱۵۰۰۰۰) ایک لاکھ پچاس ہزار تھی۔ اگر اسی طرح کا پروگرام پائیدار بنیادوں پر رکھ دیا جائے تب معیار اور تعلیم میں زبان کا استعمال دونوں کافی مضبوط ہو سکتے ہیں۔

اینار ہوگن (Einar haugan) ایک لہجہ (Vernacular) کو معیاری زبان تک ترقی دینے کیلئے چار پہلو Aspcet بتاتا ہے۔

(۱) قسم کا انتخاب (Slection of form) ایک لہجہ کا انتخاب جو معیار کی بنیاد بنے۔

(۲) لہجہ کی صحیح ترتیب (Condifcation of form) یہ فیصلہ کرنا صحیح زبان کونسی ہے اور کونسی نہیں ہے۔

(۳) زبان کا دائرہ اثر (Elaboration of function) زبان کو اس حد تک ترقی دینا کہ وہ تمام لازمی استعمال کے میدانوں کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

(۴) کمیونٹی کا قبول کرنا (Acceptance of the Community) اگر ایک زبان کو اس میں بات کرنے والوں کی بڑی اکثریت استعمال میں نہ لائے تو ظاہر ہے وہ ایک تصوراتی معیار (Standard) ہوگا۔

میں یہاں ہر ایک پہلو پر بلوچی زبان کے حوالہ سے اور خاص کر مادری زبان میں تعلیم کے متعلق مختصر بات کرونگا۔

(۱) قسم کا انتخاب (Selection of Norm):۔ ایک لہجہ جو ایک زبان کی معیار کے طور چنا جائے پہلے سے بھی موجود ہوسکتا ہے۔ یا مختلف لہجوں کے ملانے سے بھی بن سکتا ہے پہلے سے موجود کی اچھائی یہ ہے کہ اس میں بہت سے لوگ حقیقت میں بات کرتے ہیں اس کی کمزوری یہ ہے کہ دوسرے لہجوں میں بات کرنے والے اسے نہ مانیں اور نئے بننے والے لہجے کی اچھائی یہ ہے کہ ہر لہجے میں بات کرنے والے اسے مان جائیں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بھی اسے نہ مانے کیونکہ اس لہجہ میں، موجود لوگوں میں سے کوئی بھی بات نہیں کرتا۔ مادری زبان میں تعلیم کے پرگرام کے لئے جو پاکستان میں شروع کی گئی ایک کوشش کی گئی کہ مشرقی اور مغربی بلوچی کو ملا کر نیا لہجہ بنایا جائے بنیادی کتابوں میں مشرقی لہجہ کے کافی الفاظ بہت سے مغربی لہجہ میں بات کرنے والوں کے لئے ایک مسئلہ تھے۔ وہ کتاب جو ۱۹۹۱ء میں پہلی جماعت کے لئے چھپی میں ۱۹۹۰ء کے سال کے کتاب کے مقابلے میں مشرقی لہجہ کے الفاظ بہت کم تھے۔ کچھ نے یہ خیال کیا کہ مستقبل میں صرف مغربی لہجہ معیار (Standerd) کے لئے استعمال ہوگا۔

(میں یہاں مغربی لہجہ میں دونوں مغربی (رخشانی) اور جنوبی (مکرانی) لہجوں کی گروپ بندی کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے سے کسی حد تک نزدیک ہیں اگر چہ جنوبی اور مغربی بلوچی کے درمیان بھی کافی الفاظ مختلف ہیں۔ اسی طرح فقروں کی ارگیٹو (Ergative) ترتیب اور پری پوزیشن (Perposition) بھی مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لحاظ سے الفاظ کی قسمیں (Morphology) اور آواز (Phonology) بھی مختلف ہیں) ظاہر ہے ایک زبان کے مستقبل کے لئے یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ یہاں سے گزرنے کے چار راستے ہیں اور چاروں مسائل سے پر ہیں۔

(۱) جس حالت مین زبان ہے اسے ویسے ہی چھوڑ دیں۔ اسے معیاری بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اور تعلیم یا عام استعمال میں اسے نہ لائیں۔

(۲) ان میں سے ایک لہجہ کو اسٹینڈ ڈائز (Standardies) کریں مثلاً مغربی لہجہ کو اور یہ امید رکھیں کہ مشرقی لہجہ میں بات کرنے والے اسے بہت زیادہ اجنبی نہیں مانیں گے اسے سمجھیں گے اور اپنی مادری زبان کی طرح استعمال میں لائیں گے۔ میرے خیال میں معقول وجہ ہے کہ مغربی لہجہ میں بات کرنے والے آسانی سے مشرقی لہجہ کو معیاری نہیں مانیں گے۔

(۳) مغربی اور مشرقی لہجوں کو ملا کر سٹینڈرڈائز (Standerdies) کریں۔ لیکن یہ وہی کوشش ہے جو ۱۹۹۱ء مین مادری زبان میں تعلیم کے پروگرام میں ہوا اور زیادہ کامیاب دکھائی نہیں دیا (نوٹ:۔ ۱۹۹۱ء میں جو کوشش بلوچی میں تعلیم کے سلسلہ میں ہوا

وہ ناکام نہیں ہوا بلکہ بلوچستان نیشنل الائنس کی حکومت کے بعد آنے والی کمزور حکومتوں کو اسے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اسوقت کوشش یہ کی گئی کہ دونوں لہجوں کا املا ایک ہو اور ہر کوئی اپنے لہجے میں الفاظ ادا کرے اور پڑھے۔ مترجم)۔

(۴) دونوں لہجوں مغربی اور مشرقی کو ترقی دیں اور یہ مانیں کہ کم از کم عملی میدان میں دونوں لہجے ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ ایک نہیں ہو سکتے اگر چہ یہ عمل دونوں کو جدا زبانیں قرار دینے کے مترادف ہے۔ یہ فیصلہ شاہد بہتوں کے لئے قابل قبول نہ ہو۔

ان چاروں میں سے ایک بھی بہت زیادہ پسندیدہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ لہجہ سے منسلک نسلی مسئلہ کو تیزی سے اٹھائیں گے۔ کام کا نہ ہونا آگے نہ بڑھنے کی سب سے بڑی وجہ ہے جو آج تک سامنے آرہا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ اگر بلوچی کو تعلیم اور دیگر عام میدانوں میں استعمال میں نہ لایا گیا۔ تو پھر ہمسایہ اور سرکاری زبانیں دوسرے بہت سے میدانوں میں اپنی استعمال سے بلوچی کو چاٹتی جائیں گی۔

لہجہ کی صحیح ترتیب (Codification of form)

تعلیم اور دوسرے عام استعمال کے لئے یہ ضروری ہے کہ زبان کی کوئی معیاری شکل اپنائی جائے جب یہ فیصلہ ہو جائے کہ کونسا لہجہ اپنانی ہے پھر یہ بھی ضروری ہے کہ الفاظ گرائمر رسم الخط، املا کا مستقل فیصلہ کیا جائے ان تمام مسائل پر ڈاکٹر کارینا جاہانی نے تفصیل سے بحث کی۔

یہ بہت سود مند ہوا کہ ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر کارینا جاہانی کی کتاب بلوچی زبان کی

سٹینڈرڈائزیشن اور رسم الخط شائع ہوئی تو بلوچستان صوبہ میں پہلے سے منتظر مادری زبان میں تعلیم شروع ہوئی جیسا کہ اوپر کہا گیا مشرقی اور مغربی بلوچی لہجوں کے رسم الخط (املا) کو ایک بنانے کی کوشش میں پانچ نئے ملے ہوئے نشان (حروف) اپنائے گئے اور وہ پانچ نشان یہ ہیں۔

(۱) فپ،، پ اورف کے لئے جیسے لاپ یا لاف

(۲) ث،، ت اورث کے لئے جیسے مات یا ماث یا ماس

(۳) ذ،، د اور ذ کے لئے جیسے وادیا واذ

(۴) خ ک،، ک اور خ کے لئے جیسے گنوک یا گنوخ

(۵) غ ک،، گ اور غ کے لئے جیسے روگ یا روغ

جب مغربی اور مشرقی لہجوں کے رسم الخط کو ملا کر معیاری بنانے کی جرات مند (Valiant) کوشش ہوئی تو وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ اور ۱۹۹۱ء میں جب سکول کی پہلی جماعت کے لیئے دوبارہ کتاب شائع ہوئی تو ,,نئے نشان،، (حروف) ترک کیے گئے اور زیادہ مغربی لہجہ اپنایا گیا۔ حقیقت میں لہجہ کے بہت سے اختلافات کو مشرقی لہجہ کے صحیح لکھنے (Spelling) سے کافی حد تک پر کیا جا سکتا ہے۔ جو مغربی لہجہ کے آواز کی پہچان (Phonology) سے زیادہ ہیں مثلاً بہت سے مشرقی لہجہ میں بات کرنے والے ف کو پ خ کو ک اور غ کو گ پڑھتے ہیں لیکن ث اور ذ کا مسئلہ آسان نہیں۔ جبکہ ث س پڑھا جاتا ہے۔ (ماس کے لئے صحیح ہے

لیکن کتہ کے لئے نہیں)اور ذ جیسے ز۔جیسا کہ کہا گیا کہ مشرقی لہجہ کی صحیح لکھنے (Spelling) کی تعداد جو مغربی لہجہ سے زیادہ ہے بولنے میں زیادہ مسئلہ نہیں لیکن لکھنے میں مسئلہ ہوسکتا ہے۔اس طرح جو اپنی زبان میں لکھنا (Spelling) چاہیں چا ہے وہ دوسری زبان مثلا اردو فارسی میں مکمل لکھ سکتے ہوں۔ہوسکتا ہے وہ اپنی زبان کے رسم الخط اور صحیح لکھنا (spelling)جو معیاری زبان کا ہو ،فی البدیح (Intuitively!) جان نہ سکیں۔مثلا سید ہاشمی کے رسم الخط کے بارے میں یہ صحیح ہے۔ سید ہاشمی کا مرفوفونمیک (Morphophonemic) جو خاص فونومیک (Phonemic) سسٹم کے بالکل الٹ ہے۔پڑھنے والوں کے لئے آسان ہے کہ وہ ہوموفونک مارفیمز (Homophonic Morphemes) میں تمیز کریں۔ لیکن جو اس طرح لکھنا پڑھنا چاہیں۔انہیں کچھ خاص سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے (دیکھیں خاص (e) ءمرفیم کے لکھنے کے سات مختلف طریقے ہیں)اس کی وجہ سے بہت سے بلوچ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ نہیں جانتے کیسے اپنی زبان کو لکھیں او۔مجبورا دوسری زبان میں لکھنا بہتر سمجھتے ہیں معیار (Standard) تجویز کردہ عمل نہیں ہونی چاہئے شاید سب سے بہتر طریقہ اس مسئلہ کو سلجھانے کا یہی ہے کہ لوگ جس لہجہ میں بھی لکھیں بات کریں یا جو رسم الخط اپنائیں وہ غلط نہیں ہیں۔(شاید کچھ یہی کریں گے) لیکن ایک خاص مقصد کے لئے جو زبان استعمال ہو وہ معیاری (Standardies) ہو جہاں تک مادری زبان مین تعلیم کے

پروگرام کا سوال ہے۔ایک معیار اپنانا لازمی ہوگا لیکن ضروری نہیں کہ یہی معیار دوسرے استعمال کے میدانوں میں بھی مخصوص ہو بہر حال اگر پانچ لاکھ بلوچ ایک لہجہ میں جو سکولوں میں پڑھائی جاتی ہو پڑھ لکھ جائیں تو پھر ہر ادیب، ادیبہ کے لئے یہ سودمند ہوگا کہ اسی طرح لکھے تا کہ وہ پڑھنے والے اس کی تحریر کے مواد کو پڑھ سکیں۔

فیش مین (Fishman) ۱۹۹۱ء میں سکولوں میں مانی گئی معیار (Standard) کے مقابلے دوسرے لہجوں کو برداشت کرنے کے سوال پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ اس طرح سب سے بہتر انداز میں حل ہوسکتا ہے کہ زبان کی تبدیلی کو دوبارہ اصل حالت میں لانے (Reversing Language Shift) کی کوششیں efforts مقامی لہجوں کو قبول کریں، استعمال میں لائیں اور عزت دیں (یقینی طور پر پرائمری سکولوں اور یہاں تک کے عام ایجنسیز اور کاموں میں) انہیں معیاری زبان کے برابر یا معیاری زبان سے بھی ترجیح دیں۔ اساتذہ ضروری ہے کہ ہمیشہ حالات کی بنیاد پر شروع کے کلاسوں میں لہجہ کی باتوں کو مانتے ہوں چاہے زبان کو اصلی حالت میں لانے (Reversing Language Shift) کا کام ہو رہا ہو یا نہیں۔ اساتذہ لازمی طور پر طالب علموں میں لہجہ کو ماننے کی روایت ڈالیں۔ اس کا لحاظ رکھے بغیر کہ کلاس میں ایک دو یا زیادہ لہجے موجود ہیں مقامی لہجوں کا برداشت نوجوانوں میں بھی رواج دیا جانا چاہیے معیار (Standerd) مقامی لہجوں کو نہ تو دھکیلتا ہے اور نہ ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ بلکہ وہ انہیں اس طرح مکمل کرتا ہے کہ جن میدانوں

میں وہ خود پورے نہیں اترتے وہاں انہیں پورا کرتا ہے۔

زبان ایک مظہر کی انتہا ہے، (language is a bottom up phenomenon) زبان کے حقوق کو یکطرفہ بے دردی سے کچلنے سے زبان کے ساتھ کیا ہوتا ہے ایک تعلیم یافتہ سے نہیں بلکہ عام لوگوں کے ہجوم سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ زبان کی جو خاص قسم تعلیم میں استعمال ہوتی ہے وہ زبان کی سمت کو اس طرف متعین کرنا شروع کرتی ہے جس طرف اسے جانا ہوتا ہے، لیکن امید ہے زبان کو وسیع کرنے میں دوسرے لہجے جو خزانہ لاتی ہیں ان کے لئے کافی جگہ موجود ہے۔ بلوچی ایک ایسی زبان ہے جسے خدا نے مختلف لہجوں اور متبادل لفظوں کے خزانوں سے نوازا، جس کی گواہی بلوچی زبان سیکھنے والا ہر نوجوان دے گا۔ یہ بڑی شرم کی بات ہوگی اگر اس خزانہ کو ضائع کیا جائے چاہئے یہ زبان کی مضبوطی کے لئے کیوں نہ ہو جو معیار (Standarisation) سے آتی ہے۔

رسم الخط اور املا (Spelling) کے بارے کوئی مورثی اثاثہ نہیں جس میں ایک سے زیادہ لکھنے کے طریقے ہوں۔ زبان کی مستقبل کے لئے لکھنے کی ایک مخصوص طرز سے وابستہ رہنے کی بجائے اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال بہت ضروری ہے۔ زبان کے لئے کئی درجن ادیب جن کو معیار پر عبور حاصل ہو سے کئی لاکھ پڑھے لکھے لوگ جو روایتی غیر معیاری رسم الخط استعمال کرتے ہوں لاکھ درجے بہتر ہیں۔

زبان کا دائرہ اثر ELABORATION OF FUNCTION

جیسا کہ اوپر کہا گیا بلوچی زبان کی کامیابی اور سلامتی کے لئے ضروری ہے۔ کہ جتنے بھی میدانوں میں ممکن ہو اسے استعمال میں لایا جائے اس کا مطلب ہے اس دوران جب اس کا استعمال تعلیم، پریس، تجارت، کاروبار اور ٹیکنالوجی میں ہوگا تو صاف ظاہر ہے بلوچی زبان خود متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ان نئے میدانوں کو عبور کرنے کے لئے اسے اپنے الفاظ کے ذخیرے کو وسعت دینی ہوگی۔ زبان کی یہ ترقی اور توسیع بولنے والوں کے استعمال سے قدرتی طور پر خود بخود ہوتی ہے۔ تعلیم کے دوران نئے مضامین میں نئے الفاظ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس طرح امکان ہے کہ تعلیم کے ساتھ نئے الفاظ زبان میں شامل ہو نگے لیکن یہ عمل خطرات سے خالی نہیں۔ ڈرسلر (Dressler) ۱۹۸۲ء مین کچھ یورپی اقلیتی زبانوں پر تحقیق کے بعد یوں کہتا ہے۔ سٹینڈرڈ کو خالص اور جدید بنانے کے عمل نے سٹینڈرڈ برتون (Breton) سلوینین (Slovinion) اور کرواشین (croation) زبانوں کو اپنے اپنے اقلیتوں کے لئے سمجھنا مشکل بنادیا۔ ایک زبان کو بڑی حد تک خالص کرنا ہوسکتا ہے حقیقت میں اسے کمزور کرے اگر تبدیل شدہ یا مستعار لئے ہوئے الفاظ غلط دیکھے جائیں تو ممکن ہے یہ اس زبان میں بات کرنے والوں کو چند موضوع پر بولنے میں مشکل پیدا کریں یا بالکل نا ممکن بنادیں۔ ایک بلوچ نوجوان جس سے میں ملا کو کہانیاں اور ڈرامہ (Play) لکھنے کی صلاحیت تھی اردو میں کئی ڈرامے لکھنے کے بعد اس نے ایک ڈرامہ (Play) بلوچی

میں اپنے لہجہ میں لکھا لیکن ایک بلوچ ادیب نے اسے کہا کہ یہ صحیح بلوچی نہیں ہے۔ اس طرح اس نے اپنا لکھا ہوا ڈارمہ پھاڑ دیا اور اب وہ صرف اردو میں ڈرامے لکھتا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو اپنی مادری زبان میں مستعار لئے ہوئے الفاظ ہر موضوع پر بات کرتے ہوئے آزادی سے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ اپنے دوستوں سے بات کرتے ہیں وہ اپنی زبان کو زیادہ استعمال کر کے مضبوط کر رہے ہیں۔ جتنا کہ ہم زبان کے بارے میں جانتے ہیں یہ عمل بالکل صحیح ہے۔ یہ ایک وسیع لاشعوری عمل ہے۔ اگر بولنے والے اپنی باتیں شعوری حساب کتاب سے کریں تو وہ اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ غیر زبان میں بات کر رہے ہوں۔

کمیونٹی کا قبول کرنا ACCEPTANCE BY THE COMMUNITY

زبان کو معیاری (Standardies) کرنے کا ایک حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو دوسرے لہجوں میں بات کرتے ہیں ہوسکتا ہے، معیار انہیں دور اور غیر بنا دے بہت سوں کا بلوچستان میں مادری زبان میں تعلیم پر ردعمل اسی بات کو ظاہر کرنا تھا۔ مغربی اور مشرقی لہجوں کے گروپ بندی کی وجہ سے جو ہوا وہ ایک مسئلہ تھا۔ لیکن یہ مسئلہ ان تمام کے ساتھ اٹھ سکتا ہے جو سٹینڈرڈ کے علاوہ دوسرے لہجوں میں بات کرتے ہیں۔ اگر مادری زبان میں بنیادی تعلیم کامیابی سے پاکستانی بلوچستان میں رکھ دی جاتی پھر بھی یہ سوال باقی رہتا کہ سندھ، ایران، افغانستان، ترکمانستان اور خلیج میں بلوچی بولنے والے نافذ کردہ سٹینڈرڈ زبان سے کیسے نزدیک اور منسلک ہوں۔ بلوچی زبان کے مستقبل کو نقصان ہو

سکتا ہے اگر ان ملکوں میں رہنے والوں کو محسوس کرایا جائے کہ جب تک وہ سٹینڈرڈ قسم کی زبان میں بات نہیں کریں گے ان کی بلوچی صحیح نہیں ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ اپنے کو اُردو، فارسی، ترکمانی اور عربی تک محدود کریں۔

درسلر dressler کہتا ہے اقلیتی زبان کو مٹنے سے بچانے کے لئے لازمی ہے کہ اسے اسٹینڈرڈ کیا جائے لیکن اسٹینڈرڈ اور مقامی لہجوں کے درمیان دوری و جدائی سٹینڈرڈ زبان کے پڑھانے کو مشکل بناتا ہے۔ بریتانی (Brittany) میں اسٹینڈرڈ برتون (Breton) کم از کم لہجوں کی 1/3 خاص کر وانتیس (Vannetais) سے بہت مختلف ہے اس لئے بہت کم بچے برتون پڑھتے یا اس کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور نہ برتون کے مذہبی آیات یاد کرتے ہیں برتون اپنے اندر رابطہ کے کردار کو کنوا رہا ہے اور ٹوٹنے کے عمل میں ہے۔

آسٹریا (Austria) کے برگن لینڈ (Burgenland) میں کروایشن (croation) کے استعمال کے بارے میں وہ کہتا ہے اسکولوں میں سٹوویکین، سربوکروایشن یا کاکاوین اور استوا کین کا ملا کر پڑھانے کی کوشش نے بہت سے طلبا اور ان کے والدین کو سکولوں سے دور کر دیا اس طرح کروایشن (Croation) سکولوں میں بچوں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ یہاں سٹینڈرڈ کرنے سے بہت سے لوگ مایوس ہوگئے جو زبان کے سٹینڈرڈ ہونے سے پہلے سوچتے تھے۔ کہ وہ اس زبان میں بات کر سکتے ہیں۔

فیشمیں ۱۹۹۱ء میں مختلف لہجوں جو خطرناک حد تک کمزور ہیں اور اپنی بقاء کی

جدوجہد کررہے ہیں، کے لئے حال ہی میں منتخب اور رائج کی گئی مصنوعی سٹینڈرڈ کے منفی اثرات کے موضوع پر کہتا ہے، ایسے حالات میں جب بچے سکول سے گھر آتے ہیں اور ایسے لہجے میں بولتے پڑھتے اور لکھتے ہیں جو گھر ہمسایہ اور کمیونٹی کے لہجہ سے مختلف ہو اس سے کافی امکان ہے کہ یہ ایک نسل سے دوسری نسل سفر کرتی ہوئی پہلے سے کمزور اور مٹتی ہوئی مادری زبان کے لئے ایک اضافی نفسیاتی بوجھ بن جائے۔ وہ والدین جو یہ تاثر لیں کہ ان کی مادری زبان اصلی یا صحیح زبان نہیں ہوسکتا ہے وہ اپنی زبان بالکل چھوڑ دیں نہ کہ اس کو زندہ رکھنے کے لئے بار بار کوشش کریں۔

اختتامیہ (Conclustion)

بلوچی کی سلامتی اور اسے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو بلوچی زبان کے استعمال کے میدان کو وسیع تر کیا جائے خاص کر تعلیم اور دوسرے عام میدانوں میں۔ تعلیمی لحاظ سے مادری زبان میں تعلیم کی وسیع تر سماجی اور اقتصادی کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ مادری زبان میں سماجی اور اقتصادی تحاریک (Incentives) ہوں مادری زبان میں تعلیم کے پروگرام کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کو معیاری (Standardise) کیا جائے اس کے لئے لہجہ کا انتخاب سب سے مشکل پہلو ہوسکتا ہے۔ جو بھی سٹینڈرڈ منتخب کیا جائے وہ ضروری ہے یہ تاثر نہ دے کہ زبان کے دوسرے لہجے صحیح نہیں ہیں۔ کوئی بھی منتخب رسم الخط (املا) لوگوں کو اپنے لہجے میں لکھنے پڑھنے سے مایوس کرنے کا سبب نہ بنے بلکہ وہ لوگوں کو اپنی زبان کی ترقی اور تمام میدانوں میں اس کے مکمل استعمال کا وسیلہ بنے۔

تعارف:

ڈاکٹر دین محمد بزدار اندر پڑ ضلع موسیٰ خیل بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول راڑہ شم سے حاصل کی۔ انٹر گورنمنٹ کالج لورالائی سے پاس کی۔ ۱۹۷۱ء میں ڈاوء میڈیکل کالج کراچی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۷ء میں بلوچستان ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ صوبے کے مختلف اضلاع میں میڈکل آ فیسر، میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اور ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۲۰۰۹ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ وہ نصیر خان بلوچ کے قلمی نام سے اخبارات میں مضامین لکھتے رہے ہیں۔ بلوچی جو انکی مادری زبان ہے کی بقا اور ترقی کیلئے کوشاں ہیں۔ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ اکثر بلوچ سیاستکار، طلبا تنظیمیں اور دانشور حضرات مادری زبان کی ترقی کیلئے سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان کے مطابق زبان جو کہ قومی حقوق، شناخت اور قومی بقا کی ضمانت ہوتی ہے کی ترقی کے معنی اسے تعلیمی زبان قرار دینے کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

Layout by: Beebarg

Education has the power to transfer people and countries alike,because it is the wellspring of equality,ability,social qpertunity,economic stability, and national progress.UNESCO.

ترجمہ:۔ تعلیم ہی وہ طاقت ہے جو لوگوں اور قوموں کو برابری کی سطح دلا سکتا ہے، کیونکہ تعلیم برابری، انسانی صلاحیت، معاشرتی مواقعو، معاشی استحکام اور قومی ترقی کا سرچشمہ ہے

فہرست مضامین

☆۔پیش لفظ	3
☆۔تعارف	6

حصہ اول

1	بلوچ، بلوچستان اور بلوچی	11
1.1	ادیب، شاعر، گلوکار اور بلوچی	14
1.2	بلوچی زبان، رسم الخط اور اِملا	17
1.3	زبان اور اُس کی طاقت	20
1.4	بلوچ علماء کرام اور بلوچی زبان	23
1.5	قوم پرست اور بلوچی زبان	25
1.6	بلوچی زبان اور میڈیا	27